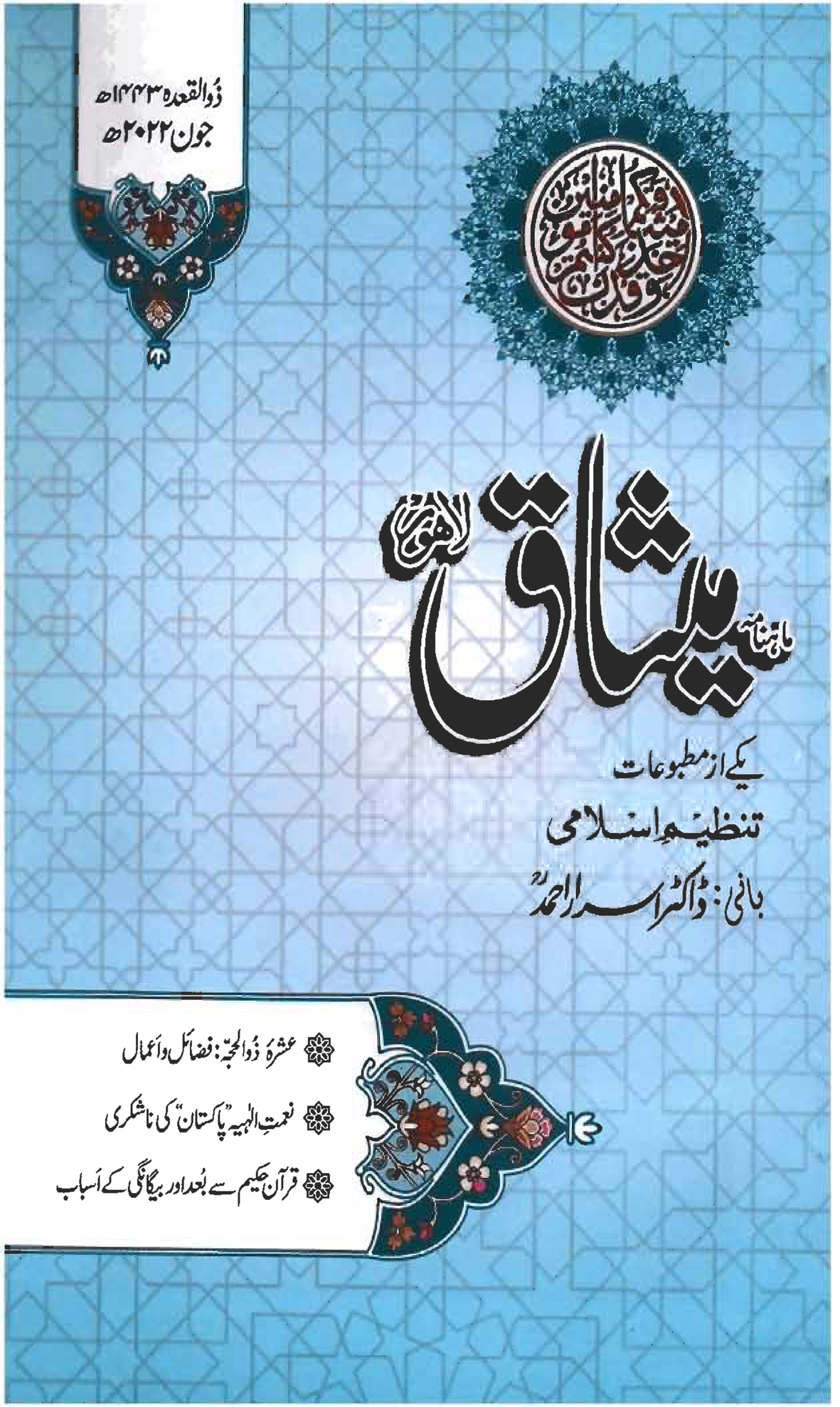

ذوالقعدہ ۱۴۴۳ھ
جون ۲۰۲۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- عشرۂ ذوالحجہ: فضائل و اعمال
- نعمتِ الٰہیہ ”پاکستان“ کی ناشکری
- قرآن حکیم سے بُعد اور بیگانگی کے اسباب

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد : 71

شمارہ : 6

ذوالقعدہ 1443ھ

جون 2022ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِتعاون: 400 روپے

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مدیر

حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

ادارتی معاون:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5

امریکہ کی غلامی اور فتنۂ دجّال — ادارہ

بیانُ القُرآن 9

سورۃ الجمعۃ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وَلَیَالٍ عَشْرٍ 27

عشرۂ ذوالحجہ: فضائل و اعمال — عاطف محمود

دعوتِ فکر 37

اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت "پاکستان" کی ناشکری — خورشید انجم

اعتصامش کُن . . . . ! 49

مسلمانوں کے قرآن مجید سے بُعد

اور بیگانگی کے اسباب — پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ

تذکیر و موعظت 66

عمر رسیدہ مسلمان — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

علومِ قرآنی 71

تفسیر کا ارتقاء — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

امریکہ کی غلامی اور فتنۂ دجّال

معرکۂ حق و باطل اپنے آخری دور میں داخل ہو چکا ہے۔ جوں جوں ظہورِ دجّال کا زمانہ قریب آ رہا ہے دنیا پر دجل‘ فریب اور باطل کا غلبہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کہنے کو تو خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ محض ایک صدی قبل ہوا اور اس کے بعد اُمّت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ٹکڑے پر ایک مخصوص مافیا کو بٹھا دیا گیا لیکن حقیقت میں اس مافیا کی تعلیم و تربیت کلونیل مقاصد کے زیر سایہ بہت پہلے شروع ہوئی۔ نوآبادیاتی (colonial) دور میں اس مافیا کو پالا پوسا گیا اور نام نہاد آزادی کے بعد اس کو مسلم دنیا پر مسلّط کر دیا گیا اور حکومت‘ عہدوں اور مراعات کے بدلے جو ذمہ داریاں تفویض کی گئیں وہ بنیادی طور پر دو طرح کی تھیں:

(۱) آئیڈیالوجیکل چینج: یعنی اسلام کی عمارت کے اجتماعی گوشے (سیاست‘ معیشت اور معاشرت) کو مسمار کرنا اور اس کی جگہ سیکولرزم اور سرمایہ دارانہ نظام کی عمارت کھڑی کرنا‘ دینی طبقے کا سماجی‘ سیاسی اور معاشی گھیراؤ۔ گمراہ فرقوں کو پروموٹ کرنا جبکہ حقیقی اسلامی روح کی اشاعت کا راستہ روکنا۔ دجّالی تہذیب اور کلچر کو فروغ دینا۔

(۲) ڈیموگرافک چینج: یعنی اسلام کی بنیاد پر قائم مسلمانوں کو مٹانا‘ زیر کرنا اور ان کی جگہ گمراہ اور اسلام سے متصادم نظریات و عقائد اور تصوّرات کے ماننے والوں کا تسلّط اور غلبہ قائم کرنا۔

نائن الیون کے بعد دنیا میں صرف اتنی تبدیلی آئی کہ اس سے پہلے ان دو بنیادی دجّالی نکات پر عمل درآمد ڈھکے چھپے انداز میں کئی صدیوں سے جاری تھا (سوائے سپین کے جہاں کھلے عام مسلمانوں کو مٹا دیا گیا)۔ نائن الیون کے بعد وہی ایجنڈا کھل کر سامنے آ گیا جس کے تحت پوری دنیا میں حقیقی اسلامی روح کا گھیرا تنگ کیا گیا‘ حقیقی اسلام کو بدنام کرنے کے لیے دہشت گردی سمیت ہر مکروہ سازش رچائی گئی۔ علماء اور مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا‘ اسلامی انقلابی جماعتوں پر پابندیاں لگائی گئیں‘ ان کے لٹریچر کو تلف کیا گیا۔ جو اسلامی انقلابی جماعتیں نفاذِ اسلام کی طرف بڑھ رہی تھیں ان کا راستہ روکا گیا اور انہیں کچلنے کے لیے انسانی تاریخ کے بدترین مظالم ڈھائے گئے۔

الاخوان اور افغان طالبان کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ مدرسوں اور تناظیم پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ ڈرون حملے‘ فضائی بمباری اور اس کے علاوہ بھی مختلف حیلوں بہانوں سے لاکھوں مسلمانوں کو شہید کیا گیا‘ غائب کیا گیا اور دنیا بھر کی جیلوں میں اذیتوں سے گزارا گیا۔ یہ سب کچھ پوری دنیا کے سامنے ہوا۔ کسی نے اس کی وجہ گریٹر اسرائیل کے قیام کو قرار دیا‘ کسی نے دہشت گردی کا شاخسانہ کہا‘ کسی نے تہذیبوں کا تصادم کا نام دیا اور کسی نے اسلام دشمنی اور اسلاموفوبیا کا عنوان دیا‘ لیکن اس جنگ کا بنیادی مقصد کیا ہے اس پر کسی نے غور نہیں کیا۔ حالانکہ دجّالی طاقتوں کا ہدف واضح تھا کہ وحی الٰہی کی بنیاد اور اثرات پر قائم معاشروں‘ اقدار و روایات اور انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر دنیا پر دجّالی نظام‘ دجّالی تہذیب اور معاشرت کو غالب کر دیا جائے۔

نائن الیون سے پہلے تک تو کم از کم شام اور عراق کے مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ خود اپنے ہی وطن میں اجنبی بن جائیں گے۔ وہ بھی ہماری طرح یہی سمجھ رہے تھے کہ ہمارا ملک ہے‘ ہماری وراثت ہے۔ ہماری جائیداد‘ کاروبار‘ علاقہ‘ اقدار و روایات کون ہم سے چھین سکتا ہے؟ لیکن آج وہاں کا ڈیموگرافک اسٹرکچر مکمل طور پر تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ مسلمان جو اسلام کی اصل بنیادوں پر قائم تھے انہیں یا تو مار دیا گیا‘ یا وہ مہاجر ہو گئے‘ یا پھر تباہ شدہ شہروں اور بستیوں کے کھنڈرات میں دفن ہو گئے۔ ان کے بچوں کی لاشیں کہیں سمندروں پر تیر رہی ہیں‘ عورتیں کہیں دربدر ہیں۔ اگرچہ گریٹر اسرائیل کا راستہ ہموار کرنا بھی اسی جنگ کا ایک مقصد تھا‘ لیکن اس کا اصل ہدف دجّال کی عالمی حکومت کا قیام ہے اور اس کے راستے میں اصل رکاوٹ وہ ہیں جو ایک اللہ کو ماننے والے اور صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جنگ صرف شام اور عراق تک محدود نہیں رہی بلکہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی ایک اللہ کو ماننے والے مسلمان تھے وہ اس جنگ کی لپیٹ میں آئے۔ حتیٰ کہ سری لنکا‘ میانمار‘ آسام اور سنکیانگ کے مسلمانوں سے اسرائیل کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا‘ لیکن ان کا بھی قتلِ عام جاری ہے اور اس عمل کو حتمی شکل دینے کے لیے بھارت اور اسرائیل سمیت دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف قانون سازیاں ہو رہی ہیں‘ انہیں شہریت سے محروم کیا جا رہا ہے‘ کہیں بے دخل اور کہیں قتل کیا جا رہا ہے۔ کہیں نام نہاد روشن خیالی اور ماڈرنائزیشن کے نام پر مسلمانوں کو ایمان اور اسلامی اقدار سے دور کیا جا رہا ہے۔ گویا نائن الیون کے بعد شروع جنگ کا اصل ہدف ایسا گلوبل ڈیموگرافک اینڈ آئیڈیالوجیکل چینج ہے جو دجّال کے استقبال کے تقاضے پورے کر سکے‘ چاہے بظاہر اس ہدف کا نام گریٹر اسرائیل یا اکھنڈ بھارت ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔

نائن الیون کے بعد یہی جنگ افغانستان اور پاکستان پر بھی مسلّط کی گئی۔ پاکستان نے اس جنگ میں افغانستان کے خلاف دجّالی قوتوں کا ساتھ دیا۔ آج اٹھارہ سال بعد ہم کہتے ہیں افغان یہ جنگ جیت گئے۔ جبکہ دوسری طرف ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان یہ جنگ جیت گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ اس جنگ میں افغانوں کے دشمن امریکہ کے ساتھ کھڑے تھے تو پھر آپ کیسے جیت گئے؟ حقیقت میں افغان ۱۸ سال یہ جنگ لڑنے کے بعد جیت چکے ہیں جبکہ آپ اٹھارہ سال پہلے ہی یہ جنگ ہار چکے تھے جب نائن الیون سے پہلے ہی امریکہ نے پرویز مشرف کو تخت پر بٹھا دیا تھا۔ اس کے بعد یہاں جنگ کے بغیر ہی وہ سب کچھ ہوا جو عالمی قوتیں جنگ جیتنے کے بعد کرنا چاہتی تھیں‘ اور اسی کو آپ اپنی جیت کہتے ہیں‘ حالانکہ اُمّت کے مفاد کے لحاظ سے وہ آپ کی ہار ہے۔ مثلاً:

دہشت گرد تنظیمیں سی آئی اے نے خود بنائیں، ’’را‘‘ اور ’’موساد‘‘ نے انہیں تربیت دی‘ لیکن ان کی آڑ میں بنیاد پرست مسلمانوں کا گھیرا تنگ کیا گیا‘ انہیں ڈرون حملوں اور فضائی حملوں میں شہید کیا گیا‘ اُٹھایا اور غائب کیا گیا‘ ٹارچر کیا گیا‘ بم حملوں میں شہید کیا گیا۔ یہاں تک کہ مشرف نے خود اپنی کتاب میں فخر سے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس نے پانچ پانچ ہزار ڈالر میں مسلمان بیچے اور وہ وہی مسلمان تھے جو بنیاد پرست تھے۔ مذہبی تنظیموں پر پابندیاں لگائی گئیں‘ مدرسوں کا گھیرا تنگ کیا گیا اور بہت سے مدارس بند کیے گئے۔ مساجد کو شہید کیا گیا‘ یہاں تک کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ جیسے سانحات وجود میں آئے جو شاید افغانستان اور فلسطین میں بھی یہود و نصاریٰ کے ہاتھوں بھی نہ ہوئے ہوں۔

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ یہ جنگ دہشت گردی کے خلاف تھی لیکن توحیدی اور انقلابی لٹریچر پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ جس طرح مصر اور عرب میں حسن البناء‘ یوسف القرضاوی اور مولانا مودودی کے لٹریچر پر پابندی لگائی گئی۔ حالانکہ اس کا دہشت گردی کے ساتھ کوئی بھی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح پاکستان میں توحیدی اشاعت پر بھی پابندی عائد کی گئی۔ ’’ایقاظ‘‘ جیسے رسالے بند کیے گئے‘ خلافت کا نام لینا بھی جرم بن گیا۔ گویا کہ اسلام کی بنیاد پر قائم مسلمانوں کو مکمل طور پر دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا‘ جبکہ سیکولرازم اور لبرل ازم کو فروغ دیا گیا۔ مغربی تہذیب‘ فحاشی اور عریانی کا دور دورہ ہو گیا۔ نائن الیون سے پہلے عورتوں کا لباس پھر بھی مناسب تھا لیکن نائن الیون کے بعد بتدریج گھٹتا ہوا تنگ پاجامے تک اور پھر مغرب کی طرح عریانی کی حدوں کو پار کرتا چلا گیا۔ گویا

اسلامی تہذیب و کلچر کا بوریا بستر لپیٹ دیا گیا۔ گمراہ فرقوں کو پروموٹ کیا گیا۔ قادیانیت پروان چڑھی۔ اسلامی لٹریچر اور تحریر و تقریر پر تو ہر طرح سے پابندی رہی لیکن گمراہی اور جہالت کو خوب پروموٹ کیا گیا۔ یہاں تک کہ ہر اخبار‘ ٹی وی چینل‘ ایف ایم ریڈیو اور سوشل میڈیا ان رینڈ کارپوریشنی ادیان کا مبلغ بن گیا اور اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے نئے ٹی وی چینلز‘ ایف ایم ریڈیوز اور نئے اخبارات و رسائل بھی وجود میں آ گئے۔

اس ڈیموگرافک چینج کے ذریعے جس طبقہ کو غالب کرنا مقصود و مطلوب تھا نائن الیون کے بعد چند سال میں پاکستان کی سیاست اور معیشت پر اس کا قبضہ پہلے سے کئی گنا زیادہ مستحکم ہو گیا۔ یہی منظورِ نظر طبقہ دوسری طرف قبضہ مافیا کی صورت میں بھی اس قدر تیزی سے پھیلا کہ نائن الیون کے بعد چند سالوں میں پورے پورے شہر‘ دیہات اور جنگلات اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ بیوروکریسی اور میڈیا پورے کا پورا اسی مافیا کے کنٹرول میں چلا گیا۔ قبضہ مافیا کے اپنے اخبارات اور ٹی وی چینلز وجود میں آ گئے۔ صحافیوں کو قبضہ مافیا کی طرف سے تنخواہیں ملنے لگیں اور چند سالوں میں وہ صحافی بھی پلاٹوں‘ فارم ہاؤسز‘ مہنگی گاڑیوں اور بینک بیلنس کے مالک بن گئے جو نائن الیون سے پہلے سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر دفتر جایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ میڈیا قبضہ مافیا کا ایک ونگ بن گیا جس کا مقصد قبضہ مافیا اور اس کے عالمی سرپرستوں کے مفادات کا تحفظ کرنا ٹھہر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنے اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا مہم چلانے میں میڈیا نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔

عراق اور شام میں باقاعدہ جنگ کے ذریعے جو ڈیموگرافک چینج لایا گیا وہ یہاں بغیر جنگ کے آ گیا اور جس مافیا کو غالب کرنا مقصود تھا وہ ملک کے ہر ادارے اور تمام تر وسائل و ذرائع پر مکمل کنٹرول حاصل کر چکا ہے‘ جبکہ دوسری طرف وہ طبقہ جسے دبانا اور مٹانا مقصود تھا وہ اپنی بقا کی جنگ لڑنے سے بھی قاصر ہو چکا ہے۔ گویا شام اور عراق کی طرح ہم بھی یہ جنگ ہار چکے ہیں لیکن ممکن ہے پھر بھی ’’ایک اللہ کو ماننے والوں‘‘ کی اکثریت یہ سوچ اور سمجھ رہی ہو کہ ہمارا ملک ہے‘ ہمارے ادارے ہیں‘ نظام ہے‘ جمہوریت ہے‘ آئین ہے‘ ہم آزاد ہیں‘ ہمارا کچھ نہیں بگڑا‘ وغیرہ تو ان کی یہ غلط فہمی بھی آئندہ چند سالوں میں اسی طرح دور ہو جائے گی جس طرح ڈرون حملوں‘ جامعہ حفصہ میں شہید ہونے والوں‘ اُٹھائے اور غائب کیے جانے والوں‘ قبضہ مافیا کے ہاتھوں قتل‘ ٹارچر اور لاپتہ ہونے والوں کے لواحقین کی ساری غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں (باقی صفحہ 82 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا آپس میں جوڑے اور زوجیت کا تعلق بہت نمایاں ہے‘ اس لیے کہ یہ دونوں سورتیں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے دو پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین کی تقسیم اس طرح ہے کہ سورۃ الصّف میں انقلاب کے تکمیلی منہاج (مرحلہ تصادم)‘ جبکہ سورۃ الجمعہ میں اساسی منہاج (مرحلہ تیاری) کا ذکر ہے۔ سورۃ الصّف کا مرکزی مضمون نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے‘ جبکہ سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس مقصدِ بعثت کے حصول اور اس عظیم مشن کی تکمیل کے لیے آپ ﷺ کا بنیادی طریق کار کون سا تھا۔ اپنے مضمون کے اعتبار سے سورۃ الجمعہ تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلی چار آیات میں قرآن کے ذریعے دعوت و تبلیغ اور مردانِ کار کی تیاری کا ذکر ہے۔ اس کے بعد چار آیات میں بنی اسرائیل کے تذکرے کے پردے میں ہمارے لیے عبرت کا سامان فراہم کیا گیا ہے‘ جبکہ آخری تین آیات میں نمازِ جمعہ کا فلسفہ زیر بحث آیا ہے۔

آیات ۱ تا ۴

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ الۡمَلِکِ الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ① هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ ۚ وَ اِنۡ

كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ② وَّ اٰخَرِیۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ ؕ وَ هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ③ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ④

آیت ۱ ﴿یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ الۡمَلِکِ الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ①﴾ ’’تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے‘ جو بادشاہ ہے‘ (ہر عیب سے) پاک ہے‘ بہت زبردست ہے‘ بہت حکمت والا ہے۔‘‘

یہ آیت گویا اس سورۂ مبارکہ کے لیے ایک نہایت پُرشکوہ اور پُرجلال تمہید اور آغازِ کلام ہے۔ سورۃ الصّف کے آغاز میں تسبیح باری تعالیٰ کا ذکر صیغہ ماضی میں تھا‘ جبکہ یہاں فعل مضارع آیا ہے۔ اس طرح تسبیح باری تعالیٰ کے ضمن میں گویا زمان و مکان کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے چار اسماء وارد ہوئے ہیں اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے‘ اس لیے کہ عام طور پر آیات کے اختتام پر اسماءِ باری تعالیٰ دو‘دو کے جوڑوں کی صورت میں آتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیۡهِمۡ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ ۚ﴾ ’’وہی تو ہے جس نے اٹھایا اُمّیین میں ایک رسول ان ہی میں سے‘ جو ان کو پڑھ کر سناتا ہے اُس کی آیات اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب و حکمت کی۔‘‘

﴿وَاِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ②﴾ ’’اور یقیناً اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔‘‘

اس سورت کی یہ آیت انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کے حوالے سے اسی طرح اہم ہے جس طرح سورۃ الصّف کی آیت ۹ تکمیلی منہاج کے اعتبار سے اہم ہے۔ سورۃ الصّف کی مذکورہ آیت میں حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان ہوا ہے تو آیت زیر مطالعہ میں آپؐ کے فرائضِ منصبی کا ذکر ہے۔ سورۃ الصّف کی وہ آیت اپنی اہمیت کی وجہ سے قرآن مجید میں تین مرتبہ (سورۃ الصّف کے علاوہ سورۃ التوبہ‘ آیت ۳۳ اور سورۃ الفتح‘ آیت ۲۸ کے طور پر) آئی ہے‘ تو اس آیت میں مذکور ’’انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج‘‘ قرآن حکیم میں چار مرتبہ (سورۃ الجمعہ کی اس آیت کے

علاوہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۲۹‘ ۱۵۱ اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۴ میں) بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہج کے عناصرِ اربعہ بیان کیے گئے ہیں: (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیمِ کتاب (۴) تعلیمِ حکمت۔

اس آیت کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ اس میں مطلوبہ انقلاب کی تیاری اور اس کے لیے مردانِ کار کی فراہمی کا مکمل طریقہ اور نصاب بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کی تعلیم‘ تربیت‘ تذکیر‘ ان کا تزکیہ‘ ان کا انذار سب کچھ قرآن کریم کے ذریعے سے ہوگا۔ حضور ﷺ نے لوگوں کو قرآن مجید سنانا شروع کیا تو سلیم الفطرت لوگ قرآن کی مقناطیسی تاثیر کی وجہ سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔ کسی نے فوراً ہی لبیک کہہ دیا‘ کوئی قدرے تأمل کے بعد راغب ہوا اور کسی نے نسبتاً زیادہ دیر بعد فیصلہ کیا۔ چنانچہ جس طرح دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے بالکل اسی طرح مکّہ کی آبادی کو بارہ سال کے عرصے میں آیاتِ قرآن کی تلاوت کے ذریعے سے بار بار جھنجھوڑ کر تمام سلیم الفطرت (زندہ ارواح کے حامل) افراد کو چھانٹ کر الگ کر لیا گیا۔ پھر ان منتخب افراد کا تزکیہ بھی قرآن مجید کی تلاوت سے ہی ہوا۔ قرآن مجید بلاشبہ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ (یونس:۵۷) ہے۔ جیسے جیسے یہ کلام ان لوگوں کے سینوں میں اترتا گیا دلوں کی بیماریاں دور ہوتی چلی گئیں۔ یہاں پر یہ اہم نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ دل کی بیماریاں تو بے شمار ہیں لیکن ان تمام بیماریوں کو اگر کوئی ایک نام یا کوئی ایک عنوان دیا جائے تو وہ ’’حُبِّ دُنیا‘‘ ہے۔ حُبِّ دُنیا کی گندگی جب کسی دل کے اندر ڈیرہ جما لیتی ہے تو اس کے تعفّن سے نت نئی بیماریاں جنم لیتی چلی جاتی ہیں‘ جبکہ خود حُبِّ دنیا کے جراثیم کو غذا انسان کی سوچ اور اُس کے نظریے سے ملتی ہے۔ ظاہر ہے انسان کی زندگی کا انداز اور اس کی دوڑ دھوپ کا رخ اس کا نظریہ متعین کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی تعلیم کے ذریعے ان لوگوں کے نظریات درست ہو گئے تو حُبِّ دنیا سمیت تمام باطنی بیماریوں کی گویا جڑ کٹ گئی اور بُرے اعمال و خصائل ان کی شخصیات سے ایسے غائب ہو گئے جیسے موسم خزاں میں درختوں سے پتّے جھڑ جاتے ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ اس آیت میں حضور ﷺ کے جن فرائضِ منصبی کا ذکر ہوا ہے ان میں ’’تعلیمِ حکمت‘‘ کا تعلق عام لوگوں سے نہیں ہے‘ بلکہ یہ حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کا شعبہ تخصص (area of specialization) ہے۔ ہر کوئی اس میدان کا شہسوار نہیں بن

سکتا۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ’’وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے‘ اور جسے حکمت دے دی گئی اُسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا‘‘ ـــــ بہرحال یہ آیت ہم پر یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ حضور ﷺ کے منہجِ انقلاب میں آلۂ دعوت اور آلۂ انقلاب قرآن مجید ہے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو دعوت بھی قرآن کے ذریعے دی‘ ان کی تذکیر و تبشیر کے لیے بھی قرآن پر ہی انحصار کیا۔ پھر اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کا تزکیہ بھی قرآن سے ہی ہوا اور ان کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بھی قرآن ہی بنا۔ آپ ﷺ نے قرآن کی بنیاد پر ۲۳ سال کے مختصر عرصے میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا کر کے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظامِ عدل و قسط کو بالفعل نافذ کر دیا۔ اس کے بعد پوری دنیا میں دین کو غالب کرنے کا مشن اُمّت کے سپرد کر کے آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ مشن منتقل کرتے ہوئے بھی حضور ﷺ نے اُمّت کو جو وصیت کی تھی وہ بھی قرآن کے بارے میں تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ((قَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ : كِتَابَ اللّٰهِ))[1] ’’میں تمہارے درمیان وہ شے چھوڑے جا رہا ہوں کہ جسے تم مضبوطی سے تھام لو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب!‘‘

چنانچہ آج ہمارے لیے بلکہ تا قیامِ قیامت ہر زمانے کے مسلمانوں کے لیے قرآن مجید گویا محمد رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام ہے۔ اس حیثیت میں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے کئی گنا بڑا معجزہ ہے۔ عصائے موسیٰؑ تو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں معجزہ تھا‘ آپؑ کے بعد تو وہ معجزہ نہیں رہا۔ اگر آج بھی وہ کہیں موجود ہے‘ جیسا کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس محفوظ ہے‘ تو اس کی حیثیت بس ایک لاٹھی کی سی ہے۔ اس کے برعکس حضور ﷺ کا معجزۂ رسالت یعنی قرآن مجید قیامت تک کے لیے معجزہ ہے اور ہر اُس شخص کے لیے معجزہ ہے جو اس کا حق پہچانے اور ادا کرے۔ اس حوالے سے میرا ایمان تو حق الیقین کی حد تک ہے کہ اگر کوئی شخص خلوص و اخلاص کے ساتھ قرآن مجید میں ایسی ’’محنت‘‘ کرے کہ قرآن اس کو possess کر لے تو پھر اُسے دنیا کی ہر چیز بے وقعت نظر آئے گی اور قرآن کے علاوہ کسی اور چیز میں اس کا دل نہیں

۱۔ صحیح مسلم‘ کتاب الحج‘ باب حجة النبی ﷺ۔ وسنن ابی داؤد‘ کتاب المناسک‘ باب صفة حجة النبی ﷺ۔

لگے گا۔لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت کو بالکل ہی پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ہم دنیا بھر کے علوم سیکھتے ہیں مگر اس قدر عربی نہیں سیکھ سکتے جس سے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھا جا سکے۔اس لیے کہ یہ نہ تو ہماری ترجیح ہے اور نہ ہی اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہے۔اللہ تعالیٰ کے کلام کو نظر انداز کرنے کا ہمارا یہ انداز حیرت انگیز حد تک جسارت آمیز ہے۔اس حوالے سے ذرا قرآن کی یہ وعید بھی سنیے: ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝۸۱ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝۸۲﴾ (الواقعۃ) کہ اے اللہ کے بندو! ذرا سوچو تو! کیا تم اس عظیم الشّان کلام کے بارے میں مداہنت کرتے ہو؟ اور کیا اس کی تکذیب کو تم نے اپنا وطیرہ بنا لیا ہے؟

قرآن مجید تو ظاہر ہے ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ہے۔یہ آیات اپنے نزول کے وقت تو مشرکینِ مکّہ سے مخاطِب تھیں‘ جبکہ آج ان کے مخاطَب ہم ہیں۔وہ لوگ تو نظریاتی طور پر قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے تھے اور اپنی زبانوں سے اس کی تکذیب کرتے تھے‘ جبکہ آج ہم اپنی زبانوں سے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے بعد اپنے عمل سے اس کی تکذیب کر رہے ہیں۔مقامِ عبرت ہے! قرآن مجید کی طرف تو پلٹ کر دیکھنے کے لیے بھی ہمارے پاس وقت نہیں جبکہ دنیا کے حقیر مفادات کے لیے ہم دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔کیا ہمیں اسی لیے پیدا کیا گیا تھا؟ یہی سوال تھا جس نے ابراہیم بن ادھمؒ کی زندگی بدل دی تھی۔ابراہیم بن ادھمؒ بادشاہ کی حیثیت سے غفلت اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ایک دن شکار کھیلنے میں مصروف تھے کہ انہوں نے ایک آواز سنی: يَاإِبْرَاهِيمُ أَلِهٰذَا خُلِقْتَ أَمْ لِهٰذَا أُمِرْتَ؟ کہ اے ابراہیم ذرا سوچو! کیا تمہیں اسی کام کے لیے پیدا کیا گیا تھا؟ اور کیا تمہیں اسی کام کا حکم ہوا تھا؟ اللہ جانے یہ کسی فرشتے کی آواز تھی یا اُن کے اپنے دل کی صدا۔بہرحال جو بھی صورتِ حال تھی‘ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بات ان کے دل میں گھر کر گئی اور ان کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔

آیت ۳ ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ﴾ ’’اور ان ہی میں سے ان دوسرے لوگوں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔‘‘

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳﴾ ’’اور وہ بہت زبردست ہے‘ کمال حکمت والا ہے۔‘‘

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ کا عطف اُمِّيّٖنَ پر ہے۔یعنی دوسرے کچھ اور بھی ہیں جن کی طرف آپؐ کو مبعوث فرمایا گیا۔حضور ﷺ کی بعثت تو قیامت تک لیے ہے۔ظاہر ہے آپؐ کی اُمّت میں ہر نسل‘ ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ شامل ہوں گے۔متفق علیہ احادیث کے مطابق حضور ﷺ سے جب اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے اپنا دست مبارک حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر رکھ کر فرمایا کہ ’’یہ اور اس کی قوم کے لوگ‘‘۔مزید فرمایا کہ دین اگر ثریّا پر بھی ہوگا تو اس کی قوم کا ایک شخص اس تک پہنچ جائے گا۔حضور ﷺ کے اس فرمان کے بارے میں تمام حنفی علماء متفق ہیں کہ اس کے مصداق حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں‘ جو ایرانی النّسل ہیں۔اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ایرانی قوم بحیثیت مجموعی بہت ذہین ہے۔اس قوم نے ایک سے بڑھ کر ایک فلاسفر پیدا کیا ہے‘ بلکہ ہمارے علمائے کلام تو سب کے سب ایرانی ہیں۔اس حوالے سے ایرانی قوم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یوں لگتا ہے جیسے فلسفہ اور منطق ان کی گھٹی میں شامل ہے۔ماضی میں یونان اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایران بھی فلسفہ ومنطق کے ایک اہم مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا۔بعد میں جرمن قوم نے بھی اس میدان میں نام پیدا کیا۔یہ سب اقوام حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت حام کی نسل سے ہیں۔اس ضمن میں میری تحقیق یہ ہے کہ حضرت سام کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے چُن لیا تھا‘ جبکہ حضرت حام کی نسل کو حکمت میں برگزیدہ کیا تھا۔

میں نے آیت زیر مطالعہ کو ایٹم (atom) اور اس کے مرکزہ (nucleus) کے گرد مختلف دائروں میں گھومنے والے الیکٹرانز کی مثال سے سمجھا ہے۔اس مثال کے مطابق اُمّتِ مُسلمہ کا مرکزہ (nucleus) ’’اُمّیّین‘‘ پر مشتمل ہے۔یعنی بنو اسماعیل اور حضور ﷺ کے زمانے کے تمام اہلِ عرب جو اُس وقت آپؐ کے براہِ راست مخاطب تھے۔اس کے بعد نیوکلیس کے گرد پہلا دائرہ ایرانیوں کے الیکٹرانز سے بنا۔پھر رومی‘ قبطی‘ سندھی‘ ہندی وغیرہ اقوام کے الیکٹرانز کے دائرے بنے اور پھیلتے گئے۔یہ دائرے ظاہر ہے قیامت تک مزید بھی پھیلیں گے لیکن اُمّیّین (نیوکلیس) کے علاوہ باقی تمام اقوام کا شمار ’’آخرین‘‘ میں ہوگا۔حضور ﷺ کی دعوت کے حوالے سے ’’اُمّیّین‘‘ اور ’’آخرین‘‘ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اُمّیّین پر وہی قانون لاگو ہوا جو سابقہ رسولوںؑ کی اقوام پر ہوا تھا۔یعنی اِتمامِ حُجّت کے بعد بھی جو لوگ ایمان نہ لائیں انہیں نیست و نابود کر دیا جائے۔چنانچہ حضور ﷺ کی طرف سے اِتمامِ حُجّت ہو جانے کے بعد

''اُمّیّین'' کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی گئی۔ ۹ ہجری میں ان کو ایک اعلانِ عام (سورۃ التوبہ رکوع اوّل) کے ذریعے متنبہ کر دیا گیا کہ چار ماہ کے اندر اندر ایمان لے آؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے برعکس ''آخرین'' پر مذکورہ قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان میں سے کوئی اسلام کی دعوت کو مانے یا نہ مانے' ایمان لائے یا نہ لائے' اُسے اختیار ہے۔ حتیٰ کہ اسلام کے مکمل غلبے کی صورت میں بھی کسی سے اس کے مذہب کے بارے میں تعرض نہیں ہوگا۔ البتہ ملک کا نظام اللہ کے قانون کے مطابق چلایا جائے گا' اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا۔

آیت ۴ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۴﴾ ''اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے فضل کے بہت سے درجات ہیں اور ان میں سب سے اونچا اور اعلیٰ درجہ پوری کائنات میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے مختص ہے: ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝۸۷﴾ (بنی اسرائیل) ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا فضل آپؐ پر بہت بڑا ہے''۔ حضور ﷺ کے بعد ہر اُس شخص پر بھی اللہ کا بہت بڑا فضل ہے جو حضور ﷺ کے دامن سے وابستہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمیں اس نے اپنا یہ فضل پیدائشی طور پر عطا فرما دیا اور ہمیں ایسے گھروں میں پیدا کیا جہاں پیدا ہوتے ہی ہم نے اپنے کانوں میں اذان اور اقامت کی آوازیں سنیں۔ سورۃ الحجرات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ (آیت ۱۷) کہ تم پر یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے تمہیں ایمان کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ اب اگر ہم اپنے رویے سے اللہ کے اس فضل اور احسان کی ناقدری کریں اور اللہ کی نافرمانی کے راستے پر چل کر راندۂ درگاہ ہو جائیں تو ہم سے بڑا بدنصیب کون ہوگا!

اس حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھنے کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا تعلق دنیوی آسائش و آرام اور مال و دولت سے نہیں ہے۔ اس ضمن میں خود حضور ﷺ کی مثال ہی لے لیجیے۔ دُنیوی لحاظ سے تو آپؐ کو بہت سی محرومیوں کا سامنا تھا۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے یتیم پیدا کیا۔ آپؐ کی پیدائش کے وقت گھر کی مالی حالت ایسی تھی کہ کوئی دایہ آپؐ کی پرورش کی ذِمّہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے بھی آپؐ کو صرف اس لیے قبول کیا کہ انہیں کوئی اور بچہ ملا نہیں تھا۔

اس کے بعد آپؐ کے لڑکپن اور جوانی کا دور بھی سخت مشقت اور مزدوری میں گزرا۔ آپؐ خود فرماتے ہیں کہ میں چند ٹکوں کے عوض قریش کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ متعلقہ حدیث میں درہم یا دینار کا ذکر نہیں بلکہ ''قراریط'' کا لفظ آیا ہے جو ریزگاری کے لیے استعمال ہوتا تھا' یعنی چند ٹکے یا پیسے۔ آپؐ کی اس دور کی زندگی کی جھلک سورۃ الضحیٰ کی ان آیات میں بھی نظر آتی ہے:

﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸﴾

''کیا اُس نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر آپ کو ٹھکانہ دیا! اور آپ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راہ دکھلائی! اور آپ کو نادار پایا تو مال دار کر دیا!''

اس کے بعد دورِ نبوت میں بھی آپؐ کی زندگی مسلسل فقر و فاقہ اور مصائب و مشکلات میں گزری۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپؐ کو شاعر اور مجنون کہا گیا' اوباش اور آوارہ لڑکوں نے پتھراؤ کر کے آپؐ کو لہولہان کر دیا۔ غرض آپؐ کی دنیوی زندگی مجموعی طور پر سخت مشکلات اور مشقت میں گزری۔ جبکہ دوسری طرف آپؐ کی شان یہ ہے کہ پوری کائنات میں اللہ کا سب سے بڑا فضل آپؐ پر ہے۔ چنانچہ اللہ کے فضل کے اپنے انداز اور اپنے پیمانے ہیں۔ دنیوی ناز و نعم' عیش و عشرت' عزّت و شہرت وغیرہ کو اس کا معیار نہیں سمجھنا چاہیے۔

یہاں پر سورۃ کی پہلی چار آیات کا مطالعہ مکمل ہو گیا ہے۔ ان آیات میں حضور ﷺ کی بعثت کے حوالے سے آپؐ کے فرائضِ منصبی کا ذکر ہے اور اس اُمّت کی ''آفاقی'' حیثیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی سابقہ اُمّتِ مُسلمہ (بنی اسرائیل) یک نسلی (uni racial) اُمّت تھی' جبکہ موجودہ اُمّتِ مُسلمہ ملٹی نیشنل اُمّت ہے' جس میں عربی' فارسی' ہندی' چینی وغیرہ ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ شامل ہیں' بلکہ اس وقت دنیا میں شاید ہی ایسی کوئی قوم یا نسل موجود ہو جس کے افراد اس اُمّت میں شامل نہ ہوں۔ ان آیات میں دوسری بات یہ واضح کی گئی ہے کہ حضور ﷺ کا آلۂ دعوت اور آلۂ تربیت صرف اور صرف قرآن تھا۔ اسی سے آپؐ نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اسی سے انہیں انقلابی جِدّوجُہد اور جہاد و قتال کے لیے تیّار کیا۔

اب اگلی چار آیات میں بنی اسرائیل کی مثال کا آئینہ دکھا کر ہمیں ہمارے مجموعی طرزِ عمل سے آگاہ کیا جا رہا ہے:

آیات ۵ تا ۸

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۶ وَ لَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۷ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸ ع

آیت ۵ ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ﴾ ’’مثال اُن لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے‘ پھر وہ اس کے حامل ثابت نہ ہوئے‘ اُس گدھے کی سی (مثال) ہے جو اٹھائے ہوئے ہو کتابوں کا بوجھ۔‘‘

جب وہ لوگ حاملِ تورات ہو کر بھی تورات سے بے گانہ رہے تو ان میں اور اس گدھے میں کیا فرق رہ گیا جو اپنی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ ظاہر ہے ایک گدھے پر آپ مکالماتِ افلاطون لاد دیں یا انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کی تمام جلدیں رکھ دیں‘ اس سے اس کے اندر نہ تو کوئی فلسفیانہ بصیرت پیدا ہو گی اور نہ ہی اس کے دماغ میں کوئی معلومات منتقل ہو سکیں گی ـــــ آیت کے اس حصے میں لفظ حمل مختلف صیغوں میں تین مرتبہ آیا ہے۔ حمل ایسے بوجھ کو کہا جاتا ہے جسے آدمی اٹھا کر چل سکے۔ اسی معنی میں حمّال (قُلی) اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بوجھ وغیرہ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جائے اور یہی مفہوم عورت کے حمل کا بھی ہے: ﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ﴾ (لقمٰن:۱۴) ’’اس کو اٹھائے رکھا اُس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر‘‘۔ عورت کو یہ حمل اٹھانے میں مشقت اور تکلیف کا سامنا تو کرنا پڑتا ہے‘ لیکن اس کے لیے اس بوجھ کو اٹھائے پھرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اِصْر

(البقرۃ:۲۸۶‘ الاعراف:۱۵۷) ایسا بوجھ ہے جس کا اٹھانا انسان کے لیے ممکن نہ ہو اور وہ اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ جس قوم کو اپنی کتاب عطا کرتا ہے اس قوم پر اُس کتاب کے حقوق کا بوجھ بھی ڈالتا ہے۔ ان حقوق میں کتاب پر ایمان لانے‘ اس کے احکام پر عمل کرنے اور اس کی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کی ذمہ داری کا بوجھ بھی شامل ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾ (آل عمران:۱۸۷) ’’اور یاد کرو جبکہ اللہ نے ان لوگوں سے ایک قول و قرار لیا تھا جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لازماً اُسے لوگوں کے سامنے واضح کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں‘‘۔ یہ میثاق اہلِ تورات سے لیا گیا تھا جبکہ قرآن مجید میں اہلِ کتاب سے متعلق ایسے واقعات اور ایسی مثالوں کا ذکر ہمیں خبردار کرنے کے لیے آیا ہے‘ کہ اے اہلِ قرآن تمہیں بھی اپنی کتاب کے حقوق کما حقہٗ ادا کرنے ہیں اور اس کی تعلیمات کو لوگوں کے لیے عام کرنا ہے۔ ورنہ کتابوں کا بوجھ اٹھانے والے گدھے کی مثال کا اطلاق تم پر بھی ہو گا۔ اس حوالے سے حضرت عبیدہ المُلَیکی رضی اللہ عنہ کا روایت کردہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بہت اہم ہے:

((يَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ ، وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ، وَافْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)) (۲)

’’اے قرآن والو! تم قرآن کو تکیہ (ذہنی سہارا) نہ بنا لینا‘ بلکہ تمہیں چاہیے کہ رات اور دن کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے‘ اور اس کو پھیلاؤ‘ اور اس کو خوش الحانی سے پڑھو‘ اور اس میں تدبر کرو‘ تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔‘‘

مقامِ عبرت ہے! آج ہم قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کے لیے تو غور کرنے کو بھی تیّار نہیں‘ لیکن اس کو تکیہ بنانے کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے میں ہم بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال ایوبی دور کی یادگار‘ سونے کی تاروں سے لکھا ہوا چالیس مَن وزنی قرآن مجید کا وہ نسخہ ہے جسے ہم نے پچھلے پچاس سال سے لاہور میں نمائش کے لیے رکھا ہوا ہے۔

۲۔ رواہ البیھقی فی شعب الایمان‘ بحوالہ مشکاۃ المصابیح‘ کتاب فضائل القرآن‘ باب آداب التلاوۃ ودروس القرآن۔

﴿بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''بہت بُری مثال ہے اُس قوم کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔''

یہ یہودیوں کی طرف سے کلام اللہ کی عملی یا حالی تکذیب کا ذکر ہے۔ قبل ازیں سورۃ الواقعہ کی آیت ۸۲ کے حوالے سے وضاحت کی جا چکی ہے کہ بالکل اسی طور سے ہم بھی قرآن مجید کو جھٹلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اپنی زبان سے نہ تو یہودی تورات کی تکذیب کرتے تھے اور نہ ہی ہم قرآن کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہیں۔ لیکن کیا ہم واقعی قرآن مجید کی عملی یا حالی تکذیب کے مرتکب ہو رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ایک ایسے تعلیم یافتہ نوجوان کا تصوّر کریں جو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پاکستان سے امریکہ گیا ہے۔ اُس نوجوان سے اگر پوچھا جائے کہ کیا قرآن مجید اللہ کا کلام ہے تو وہ کہے گا کیوں نہیں! مَیں مانتا ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ لیکن اگر اس سے دوسرا سوال یہ کیا جائے کہ آپ نے اس کو کتنا پڑھا ہے اور اس کی تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے آپ نے کس قدر محنت کی ہے تو وہ (اِلّا ماشاء اللہ) یہی جواب دے گا کہ مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ تو کیا اس نوجوان کا یہ عمل قرآن مجید کی تکذیب نہیں کر رہا ہے؟ کیا اس کا حال چیخ چیخ کر گواہی نہیں دے رہا کہ اس کے نزدیک اس کی وہ ڈگری قرآن مجید سے زیادہ اہم ہے' جس کے لیے وہ سات سمندر پار جا کر دیارِ غیر کی خاک چھان رہا ہے' لیکن قرآن مجید کو سمجھنے کی کبھی اس نے ہلکی سی کوشش بھی نہیں کی۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝۵﴾ ''اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔''

اللہ تعالیٰ کی ہدایت' معاذ اللہ' کوئی ایسی حقیر شے نہیں جسے ہر شخص کی جھولی میں زبردستی ڈال دیا جائے۔ یہ تو صرف اسی شخص کو ملے گی جس کے دل میں اس کے حصول کی تمنّا ہوگی اور جو اس کے حصول کے لیے تگ و دو کرے گا۔

آیت ۶ ﴿قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ هَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّكُمۡ اَوۡلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اے وہ لوگ جو یہودی ہو گئے ہو' اگر تمہیں واقعی یہ گمان ہے کہ بس تم ہی اللہ کے دوست ہو باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر''

زعم کا لفظ ''خیالِ خام'' کے معنی میں ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں کہ فلاں شخص کو فلاں

چیز کا بڑا زعم ہے۔ تو اگر تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے چہیتے اور محبوب ہونے کا ایسا ہی زعم ہے:

﴿فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۶﴾ ''تو تم موت کی تمنّا کرو' اگر تم واقعی سچّے ہو۔''

اگر تم واقعی اللہ کے محبوب اور دوست ہو تو تمہیں اپنے دوست سے وصل کی تمنّا ہونی چاہیے' اور یہ تمنّا چونکہ موت کے ذریعے پوری ہو سکتی ہے اس لیے تمہارے دلوں میں ہر وقت موت کی خواہش موجزن رہنی چاہیے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ البقرۃ (آیات ۹۴' ۹۵' ۹۶) میں بھی آ چکا ہے۔

آیت ۷ ﴿وَلَا يَتَمَنَّوۡنَهٗۤ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ ؕ﴾ ''اور (حقیقت یہ ہے کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی موت کی تمنّا نہیں کریں گے اپنے ان اعمال کے سبب جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ ۝۷﴾ ''اور اللہ ان ظالموں سے خوب واقف ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰى نَفۡسِهٖ بَصِيۡرَةٌ ۝۱۴﴾ (القیامۃ) کے مصداق یہ لوگ اپنے کرتوتوں کو خوب جانتے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں چاہتے کہ انہیں موت آئے اور وہ اپنی بداعمالیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں۔

ہم مسلمانوں کے لیے بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات کی حیثیت ایک آئینے کی سی ہے۔ اس آئینے میں اگر ہم اپنی تصویر دیکھیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ زعم صرف بنی اسرائیل میں ہی نہیں پایا جاتا تھا بلکہ آج ہم مسلمانوں کی اکثریت بھی اسی سوچ کی حامل ہے' اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی کتاب سے ہمارا ذہنی و قلبی رشتہ نہ رہا تو اپنی تسلی کے لیے ہمیں خود ساختہ خوش فہمیوں (wishful thinkings) کا سہارا لینا پڑا۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے مؤثر خوش فہمی تو یہی ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے' ہم اللہ کے محبوب ترین نبی حضرت محمد ﷺ کی اُمّت ہیں اور اس رشتے سے اللہ کے بہت ہی لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسے بھی گناہگار سہی' آخرت میں ہمارے نبیؐ یقیناً ہماری شفاعت کریں گے اور دوزخ سے ہماری خلاصی کو یقینی بنائیں گے۔ اگر خدانخواستہ ہم میں سے کوئی فرد کسی بڑے جرم میں پکڑا بھی گیا تو اسے بھی بہت جلد دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارے ہاں یہ خوش فہمیاں پختہ ہو کر

باقاعدہ عقائد کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ اب ایسی ضمانتوں کے ہوتے ہوئے بھلا کون احمق ہوگا جو نیک اعمال کے لیے مشقتیں اٹھائے اور رشوت‘ چور بازاری اور دوسری حرام کاریوں سے اجتناب کرتا پھرے: ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا‘ خدا فریبی کہ خود فریبی؟
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

اقبال کا یہ شعر اس حوالے سے آج ہم پر ہو بہو صادق آتا ہے۔ پہلے تو ’’مسلمان‘‘ کے پاس عمل سے بچنے کے لیے صرف تقدیر کا بہانہ تھا‘ اب ہم نے مذکورہ بالا عقائد کی صورت میں بہت مضبوط سہارا بھی تلاش کر لیا ہے۔

آیت ۸ ﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی‘‘

﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ ’’پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اُس ہستی کی طرف جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے‘‘

اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے‘ جو کچھ تمہارے سامنے ہے اس کا بھی اور جو کچھ تمہارے پیچھے ہے اس کا بھی۔ جو کچھ بحیثیت نوعِ انسانی تمہارے لیے واضح کر دیا گیا ہے اس کا بھی اور جو کچھ تم سے غیب میں رکھ دیا گیا ہے اس کا بھی۔

﴿فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸﴾ ’’پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔‘‘

یہاں پر چار آیات پر مشتمل سورت کے دوسرے حصّے کا مطالعہ بھی مکمل ہو گیا۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت ہو چکی ہے کہ ان آیات میں تذکرہ تو یہود کا ہے لیکن یاددہانی ہماری مقصود ہے۔ چنانچہ ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے ہمیں ضرور سوچنا چاہیے کہ قیامت کے دن اگر تورات کے حقوق کے حوالے سے یہودیوں کا احتساب ہوگا تو ہم سے بھی پوچھا جائے گا کہ اللہ کے رسول ﷺ جو کتاب تم لوگوں کے حوالے کر کے گئے تھے اس کے حقوق کی ذِمّہ داری کو تم نے کس حد تک نبھایا؟ حضور ﷺ نے تو حجۃ الوداع کے موقع پر موجود لوگوں کو گواہ بنا کر قرآن

مجید کے پیغام کو تمام نوعِ انسانی تک پہنچانے کی ذِمّہ داری اُمّت کے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ اس حوالے سے آپؐ نے حاضرین کو مخاطب کر کے پوچھا تھا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ)) کہ کیا مَیں نے تم لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ تمام حاضرینِ مجمع نے جواب میں یک زبان ہو کر کہا تھا: اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ[۳] ’’ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا‘ حقِ امانت ادا کر دیا‘ حقِ نصیحت ادا کر دیا‘‘۔ بعض روایات میں حاضرین کے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں: نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ رِسَالَاتِ رَبِّكَ ، وَنَصَحْتَ لِاُمَّتِكَ ، وَقَضَیْتَ الَّذِیْ عَلَیْكَ[۴] ’’ہم گواہ ہیں کہ آپ نے اپنے رب کے پیغامات کما حقّہ پہنچا دیے‘ اور اپنی اُمّت کے لیے حق نعمت ادا کر دیا‘ اور اپنی ذِمّہ داری کما حقّہ ادا کر دی!‘‘ لوگوں کے اس جواب پر آپ ﷺ نے تین مرتبہ اللہ کو بھی گواہ بنایا: ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ)) کہ اے اللہ تو بھی گواہ رہ! یہ لوگ اعتراف کر رہے ہیں کہ مَیں نے تیرا پیغام ان تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))[۵] کہ اب جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس طرح آپؐ نے قرآن مجید کی دعوت و تبلیغ پوری نوعِ انسانی تک پہنچانے کی بھاری ذِمّہ داری اپنی اُمّت کی طرف منتقل فرما دی۔ ظاہر ہے اس ذِمّہ داری کے بارے میں کل ہم سے پوچھا تو جائے گا۔

آیات ۹ تا ۱۱

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

۳۔ صحیح مسلم‘ کتاب الحج‘ باب حجۃ النبی ﷺ۔ و سنن ابی داؤد‘ کتاب المناسک‘ باب صفۃ حجۃ النبی ﷺ۔

۴۔ مستدرک حاکم: ۶۴۵/۱‘ صحیح ابن خزیمہ: ۱۳۹۷‘ صحیح ابن حبان: ۲۸۵۶۔

۵۔ صحیح البخاری‘ کتاب الحج‘ باب خطبۃ ایام منیٰ۔ و صحیح مسلم‘ کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات‘ باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

تَعْلَمُوْنَ ۝۹ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰ وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ِۨ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۱۱

سورت کے تیسرے اور آخری حصّے میں نمازِ جمعہ کا ذکر ہے۔ نمازِ جمعہ دراصل ''حزبُ اللہ'' کا ہفتہ وار تعلیمی و تربیتی اجتماع ہے۔ ایسے اجتماعات کا انعقاد ہر انقلابی تحریک کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی زمانے میں کمیونسٹوں کے ہاں بھی اپنے کارکنوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ہفتہ وار ''سٹڈی سرکلز'' کا انعقاد بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ دراصل حزبُ اللہ کا نصب العین بہت عظیم اور راستہ بہت کٹھن ہے۔ اس راستے پر سفر جاری رکھنے کے لیے غیر معمولی صبر اور استقامت درکار ہے۔ اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ انقلابی کارکنوں کے ذہنوں میں ان کے بنیادی نظریے اور نصب العین کا شعور ہر لحظہ مستحضر رہے۔ چنانچہ جمعہ کے اجتماع کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ ہر سات دن کے بعد باقاعدگی کے ساتھ دور و نزدیک سے سب اہلِ ایمان اکٹھے ہوں اور اللہ کا کوئی بندہ نائب رسولؐ کی حیثیت سے ان کے لیے ''يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'' کا فریضہ سرانجام دے‘ تاکہ تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس کا عمل حضور ﷺ کے بعد بھی قیامت تک جاری و ساری رہے۔

اجتماعِ جمعہ کے اس پہلو کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے لیے ظہر کی نماز مختصر کر دی گئی۔ یعنی ظہر کے چار فرائض کے بجائے صرف دو رکعتیں رہ گئیں اور باقی دو رکعتوں کی جگہ خطبہ یعنی ''تعلیم و تعلّم'' کو لازم کر دیا گیا۔ اس لحاظ سے اجتماعِ جمعہ کو تعلیمِ بالغاں کا ہفتہ وار پروگرام بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس پروگرام کی اہمیت پچھلے زمانے میں اور بھی زیادہ تھی‘ جب نہ سکول کالج تھے‘ نہ یونیورسٹیاں تھیں‘ نہ کتابیں دستیاب تھیں‘ نہ اخبار چھپتے تھے اور نہ ہی آڈیو ویڈیو کی سہولیات میسّر تھیں۔ برعظیم پاک و ہند میں اجتماعِ جمعہ کی تعلیمی اہمیت کا شعور ماضی قریب کے زمانہ تک بھی موجود تھا۔ مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جمعہ کے دن شہر کی جامع مسجد میں دور دراز دیہات سے لوگ صبح سات آٹھ بجے ہی پہنچنا شروع ہو جاتے تھے۔ اس دور میں جمعہ صرف شہروں میں ادا کیا جاتا تھا‘ دیہات میں جمعہ نہیں ہوتا تھا۔ جمعہ کے لیے فقہاء نے ''مصرِ

جامع'' کی شرط عائد کی ہے۔ یعنی جمعہ ہر بستی میں نہیں بلکہ صرف اُس شہر میں ہو سکتا ہے جس میں بازار ہوں‘ قیامِ امن کا انتظام ہو‘ جامع مسجد ہو۔ لیکن جب ہر چھوٹی بڑی بستی میں جمعہ پڑھنا شروع کر دیا گیا تو مجموعی طور پر اجتماعِ جمعہ کی اہمیت کم ہونا شروع ہو گئی۔ ظاہر ہے جب ہر بستی میں جمعہ ہو رہا ہو تو لوگ اس کے لیے سفر کر کے شہر کی جامع مسجد میں بھلا کیوں جائیں گے؟

جمعہ کے اجتماعات تو آج بھی منعقد ہوتے ہیں‘ لوگ جوق در جوق ان میں شرکت بھی کرتے ہیں‘ خطبے بھی پڑھے اور سنے جاتے ہیں‘ لیکن یہ سب کچھ ایک ''رسمِ عبادت'' کے طور پر ہو رہا ہے‘ جبکہ اس اجتماع کا بنیادی فلسفہ اور اصل مقصد مجموعی طور پر ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ بقول اقبال: ؎

رہ گئی رسمِ اذاں‘ روحِ بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا‘ تلقینِ غزالی نہ رہی!

بہرحال آج کل اجتماعِ جمعہ کے حوالے سے جو ظاہری اہتمام دیکھنے میں آتا ہے اس کی حیثیت اس عمارت کے کھنڈرات کی سی ہے جو عرصہ دراز سے زمین بوس ہو چکی ہے‘ لیکن ان کھنڈرات کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ عمارت بہت عظیم الشان تھی۔

آیت ۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ﴾ ''اے ایمان والو! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور کاروبار چھوڑ دو۔''

نماز تو بہرحال اللہ کا ذکر ہے ہی‘ لیکن یہاں اللہ کے ذکر سے خصوصی طور پر خطبۂ جمعہ مراد ہے —— ''اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو'' کا مطلب یہ نہیں کہ بھاگتے ہوئے آؤ‘ بلکہ اس سے مراد مستعدی سے چل کھڑے ہونا ہے‘ یعنی جلدی سے جلدی وہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔ نماز کے لیے بھاگ کر آنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹﴾ ''یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔''

آیت ۱۰ ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ ''پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو''

یعنی جمعہ کے حوالے سے اسلام میں یہودیوں کے یومِ سبت جیسی سختی نہیں ہے کہ پورا دن اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص کر دو۔ بلکہ مسلمانوں سے اس دن صرف یہ تقاضا ہے کہ وہ نمازِ جمعہ سے قبل اپنے تمام کام کاج چھوڑ دیں۔ نہائیں دھوئیں‘ اچھے کپڑے پہنیں‘ خوشبو لگائیں اور بروقت مسجد میں پہنچ جائیں‘ تاکہ تعلیمی و تربیتی نشست سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ اسی لیے نمازِ جمعہ کے لیے اوّل وقت مسجد میں آنے والے کو حدیث میں اونٹ کی قربانی کے برابر ثواب کی بشارت دی گئی ہے۔ دوسری طرف نمازِ جمعہ ترک کرنے والے کے لیے حضور ﷺ نے سخت وعید سنائی ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ تَرَکَ ثَلَاثَ جُمُعَاتٍ مِنْ غَیْرِ عُذْرٍ طُبِعَ عَلٰی قَلْبِہٖ))(۶)

’’جو شخص بغیر کسی عذر کے مسلسل تین جمعے ترک کر دے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔‘‘

اس وعیدی حکم میں بھی یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ ہو جو تعلیم و تربیت کے اس اجتماعی پروگرام سے مستقل طور پر کٹ کر رہ جائے۔ بہرحال جمعہ کے دن ’’شرعی مصروفیت‘‘ صرف نمازِ جمعہ کی ادائیگی تک ہی ہے‘ اس کے بعد ہر کوئی اپنی دنیوی مصروفیات کے لیے آزاد ہے۔ اس لیے حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ جمعہ کے دن ’’آدھی چھٹی‘‘ قرآن مجید کے مذکورہ حکم کے مطابق کرے۔ یعنی اگر جمعہ کے دن لوگوں کو آدھی چھٹی دینا ضروری ہے تو یہ چھٹی صبح کے وقت ہونی چاہیے تاکہ لوگ آسانی سے نماز جمعہ کی تیاری کریں‘ نماز ادا کریں اور نماز کے بعد معمول کے مطابق اپنے کام نپٹائیں۔

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰﴾ ’’اور اللہ کو یاد کرو کثرت سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا﴾ ’’اور جب انہوں نے دیکھا تجارت کا معاملہ یا کوئی کھیل تماشا تو اس کی طرف چل دیے‘‘

﴿وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ﴾ ’’اور آپؐ کو کھڑا چھوڑ دیا۔‘‘

یہ خاص طور پر منافقین کے طرزِ عمل کا ذکر ہے کہ وہ تجارت اور کھیل تماشے کو اللہ کے ذکر

۶۔ معجم الاوسط للطبرانی: ۱۶۹/۳۔

پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں شام سے ایک تجارتی قافلہ عین نمازِ جمعہ کے وقت آیا اور اہلِ شہر کو اطلاع دینے کے لیے ڈھول بجانے شروع کر دیے۔ چونکہ قحط کا زمانہ تھا‘ لہٰذا حاضرینِ مسجد قافلے کی آمد کی اطلاع پا کر فوراً اس کی طرف لپکے۔ رسول اللہ ﷺ اُس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اکثر لوگ اس دوران اٹھ کر چلے گئے اور تھوڑے لوگ باقی رہ گئے جن میں عشرۂ مبشرہ بھی شامل تھے۔ واضح رہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے بعد بالکل قریبی دور کا ہے جبکہ لوگوں کو صحبتِ نبویؐ سے فیض یاب ہونے کا موقع بہت کم ملا تھا۔ بعض مفسّرین نے لکھا ہے کہ ابتدا میں عیدین کے خطبہ کی طرح جمعہ کا خطبہ بھی نماز کے بعد ہوتا تھا‘ اس لیے خطبہ کے دوران اٹھ کر جانے والے لوگوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ نماز تو پڑھی جا چکی ہے اس لیے اب اُٹھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہرحال اس آیت میں بھی ڈانٹ کا انداز ہے اور اس میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس سے بھی مسلمانوں کی صفوں میں اسی کمزوری کی نشاندہی ہوتی ہے جس کا ذکر قبل ازیں سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔

﴿قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۱۱﴾

’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر ہے کھیل کود اور تجارت سے۔ اور اللہ بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔‘‘ ❁❁❁

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اشاعت خاص 300 روپے، اشاعت عام 180 روپے

عشرۂ ذُوالحجّہ: فضائل واعمال

عاطف محمود *

عشرۂ ذوالحجّہ کے فضائل

اللہ ربّ العزت نے بہت سے اوقات اور جگہوں میں بقیہ کی نسبت زیادہ برکت رکھی ہے' لہٰذا علماء فرماتے ہیں کہ ان اوقات اور جگہوں میں بقیہ کی نسبت نیک اعمال کا ثواب بھی زیادہ ملتا ہے اور بُرے اعمال کا وبال بھی عام دنوں کی نسبت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ انہی اوقات میں ذوالحجہ کے ابتدائی دس دن بھی ہیں جن کی فضیلت قرآن حکیم میں اور خاص طور پر احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اتنی وارد ہوئی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین یہ گفتگو ملتی ہے کہ آیا ذوالحجہ کا پہلا عشرہ زیادہ افضلیت کا حامل ہے یا رمضان المبارک کا آخری عشرہ زیادہ فضیلت رکھتا ہے! گو حاصل کلام یہی ہے کہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ بقیہ تمام ایام سے افضل ہے اور اس کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس عشرہ میں شب قدر جیسی عظیم رات وارد ہوئی ہے جس میں کی گئی عبادت ہزار راتوں کی عبادت سے افضل ہے۔ البتہ اس کے بعد تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ ذوالحجہ کا پہلا عشرہ بقیہ ایام سے افضل ہے۔ تاہم بعض اہلِ علم کے نزدیک رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی راتیں افضل ہیں اور ذوالحجہ کے پہلے عشرہ کے دن افضل ہیں۔ قرآن حکیم میں عشرۂ ذوالحجہ کی فضیلت یوں وارد ہوئی ہے:

﴿وَالْفَجْرِ ① وَلَيَالٍ عَشْرٍ ②﴾ (الفجر)

''قسم ہے فجر کے وقت کی۔ اور دس راتوں کی۔''

حضرات عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن زبیر اور جابر بن عبداللہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور متعدد تابعینؒ کے مطابق اس سے ذوالحجہ کی پہلی دس راتیں مراد ہیں۔ (ابن جریر' مظہری' درمنثور و بغوی)

احادیث مبارکہ میں ان دس راتوں کی بہت سی فضیلتیں آئی ہیں۔ یہ دس دن حُجّاجِ کرام

---

* ناظم تعلیمات' قرآن اکیڈمی' یٰسین آباد

کے لیے خاص طور پر بڑے ہی انقلابی اور جذباتی ہوتے ہیں۔ ذوالحجہ کی پہلی تاریخ ہی سے ہر حاجی پر ایک خاص کیفیت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے ہر عمل میں ایک خاص جوش و جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور ہر طرف ایک عجیب سی چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیات دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں یہاں تک کہ منیٰ کی پُرنور راتوں کے بعد جب ۹ ذوالحجہ یعنی عرفہ کا دن شروع ہوتا ہے تو ہر ایک آنکھ آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہے۔

ہر شخص ساری دنیا سے بے پرواو بے نیاز اللہ عزّوجل سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا نظر آتا ہے۔ لاکھوں حاجیوں پر جب نظر پڑتی ہے تو بادشاہ ہو یا ایک عام آدمی' سرمایہ دار ہو یا غریب سب ایک ہی لباس میں ہر طرف موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سب کا لباس ایک' جذبہ ایک اور نعرہ ایک: لَبَّیْكَ! اَللّٰھُمَّ لَبَّیْك !!

میدانِ عرفات سے جب تمام حاجی مزدلفہ میں کھلے آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول نظر آتے ہیں تو ایک قیامت کا سا منظر ہوتا ہے۔

دس ذوالحج کو جب یوم النحر شروع ہوتا ہے تو ہر حاجی ایک نئے جذبے سے سرشار ہوتا ہے۔ اس دن کوئی شیطان سے نفرت کے اظہار کے لیے کنکریاں مارتا نظر آتا ہے' کوئی جانوروں کو ذبح کر رہا ہے' کوئی سر کے بال منڈوا رہا ہے' کوئی طوافِ زیارت کی طرف بے تابانہ بڑھا چلا جا رہا ہے۔ (تفسیر بصیرتِ قرآن' مولانا محمد آصف قاسمی)

سورۃ الکوثر کی دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ②﴾

''پس آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے رب کے لیے نماز پڑھا کیجیے اور قربانی کیا کیجیے۔''

اس آیت میں اکثر مفسّرین کے نزدیک نماز سے مراد نمازِ عید ہے' کیونکہ عیدالاضحیٰ کے دن پہلے نماز ادا کی جاتی ہے اور پھر قربانی پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ عشرہ ذوالحجہ کی ایک بڑی فضیلت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس عشرہ میں عیدالاضحیٰ اور قربانی جیسی عظیم عبادات ہیں اور حج کے اکثر ارکان بھی اسی عشرہ میں ادا کیے جاتے ہیں۔

اللہ ربّ العزت نے دینِ اسلام کی تکمیل کا اعلان بھی اسی عشرہ میں کیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج مَیں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ کے لیے) پسند کر لیا۔''

یہ عظیم آیت کہ جس میں اس بات کا اعلان ہے کہ اللہ ربّ العزت نے دینِ اسلام کی تکمیل فرما دی جو کہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت بھی ہے' ۹ ذوالحجہ' جمعہ کے دن نازل ہوئی۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خلافت کے زمانہ میں ایک یہودی نے آپؓ سے کہا کہ یہ آیت جس میں دین کے مکمل ہونے کی خبر دی گئی ہے اتنی بڑی آیت ہے کہ اگر یہ ہم پر اُترتی تو ہم اس کے اترنے کے دن کو عید کی طرح مناتے اور اس پر خوشی کا اظہار کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''تمہیں کیا پتہ ہے جس دن یہ آیت اتری' اُس دن ہماری دو عیدیں تھیں۔ ایک یہ کہ یہ دن جمعہ کا تھا اور دوسرے عرفہ کا دن۔ یہ دونوں دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی قبولیت کے دن ہیں۔'' (تفسیر ربانی' مفتی اصغر علی ربانی)

ذوالحجہ کا مہینہ ان چار مہینوں میں بھی شامل ہے جن کو حرمت والے مہینے کہا جاتا ہے۔ اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ﴾ (التوبۃ:۳۶)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ مہینے ہے جو اللہ کی کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) کے مطابق اُس دن سے نافذ چلی آتی ہے جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا' ان (بارہ مہینوں) میں سے چار حرمت والے (مہینے) ہیں۔ یہی دین (کا) سیدھا سادہ (تقاضا) ہے' لہٰذا ان مہینوں کے معاملے میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔''

حرمت والے مہینوں میں ایک تو جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑا کرنا جائز نہیں ہے۔ دوسرا اس کا مفہوم مفسّرین یہ بیان فرماتے ہیں کہ ان مہینوں میں خصوصی طور پر بُرے اعمال سے اجتناب بھی ضروری ہے' کیونکہ ان کے گناہ کا وبال عام دنوں کے مقابلے میں بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا شعوری طور پر کوشش کرنی چاہیے کہ ان مہینوں میں اللہ ربّ العزت کی نافرمانی والے اعمال سے بچا

جائے اور نیک اعمال زیادہ سے زیادہ کیے جائیں۔

ان آیات کی روشنی میں عشرہ ذوالحجہ کی فضیلت نہایت نمایاں ہو کر سامنے آئی۔ آیئے اب چند احادیث مبارکہ کی روشنی میں اس عشرہ کی اہمیت کو دیکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک طرف ان دنوں کی فضیلت اپنے کئی ارشادات سے واضح فرمائی ہے اور دوسری طرف ان دنوں میں نیک اعمال کو کثرت کے ساتھ کرنے کی ترغیب و تشویق بھی دلائی ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

((اِنَّ اَفْضَلَ اَيَّامِ الدُّنْيَا اَيَّامُ الْعَشْرِ)) (الترغیب والترھیب)

''دنیا کے تمام دنوں میں دس دن (عشرہ ذوالحجہ) سب سے افضل ہیں۔''

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((مَا مِنْ أَيَّامٍ الْعَمَلُ الصَّالِحُ فِيهَا أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْأَيَّامِ)) يَعْنِي أَيَّامَ الْعَشْرِ' قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((وَلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ' إِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فَلَمْ يَرْجِعْ مِنْ ذٰلِكَ بِشَيْءٍ)) (سنن ابی داؤد)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی دن ایسا نہیں جس میں نیک عمل اللہ کے یہاں ذوالحجہ کے دس دنوں کے عمل سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی ان کے برابر نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں' جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں! مگر وہ شخص جو جان و مال لے کر جہاد کے لیے نکلے اور پھر ان میں سے کچھ بھی واپس نہ آئے (یعنی جان و مال قربان کر دے)۔''

ان دو احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہو کر سامنے آئی کہ ذوالحجہ کے ابتدائی دس دنوں میں کیے گئے اعمال اللہ ربّ العزت کو پورے سال کیے گئے اعمال کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ ہیں اور ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان دنوں میں کیے گئے نیک اعمال سے جہاد فی سبیل اللہ جیسا عظیم اور چوٹی کا عمل بھی افضل نہیں۔

پھر ان دس دنوں میں بھی دس ذوالحجہ کا دن (یوم النحر) افضل ترین دن ہے' چنانچہ نبی

اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

((إِنَّ أَعْظَمَ الْأَيَّامِ عِنْدَ اللهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَوْمُ النَّحْرِ ثُمَّ يَوْمُ الْقَرِّ)) (سنن ابی داؤد)

’’اللہ ربّ العزت کے نزدیک سب سے زیادہ عظمت واحترام والا دن یوم النحر (دس ذوالحجہ‘ قربانی کا دن) ہے‘ پھر اس کے بعد گیارہ ذوالحجہ کا دن ہے۔‘‘

عرفہ کا دن بھی انتہائی فضیلت کا حامل ہے جو کہ نو ذوالحجہ کے دن ہوتا ہے۔ اس کی فضیلت میں حضور نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ فرماتے ہیں:

((مَا مِنْ يَوْمٍ أَكْثَرَ مِنْ أَنْ يُعْتِقَ اللّٰهُ فِيهِ عَبْدًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ)) (صحیح مسلم)

’’عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو جہنم سے آزاد کرتا ہو۔‘‘

قرآن حکیم اور احادیث نبویہؐ کی روشنی میں عشرہ ذوالحجہ کی اتنی اہمیت وفضیلت ہمارے سامنے آئی کہ جتنی فضیلت اور کسی دن اور وقت کو حاصل نہیں ہے‘ اس کی ایک وجہ حافظ ابن حجر عسقلانی ؒ یوں تحریر فرماتے ہیں:

’’عشرہ ذوالحجہ کی امتیازی شان کا بظاہر یہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ ان مبارک ایام میں نماز‘ روزہ‘ صدقہ‘ حج اور قربانی جیسی عظیم عبادات اکٹھی ہو جاتی ہیں اور ایسا سال کے دیگر دنوں میں نہیں ہوتا۔‘‘ (فتح الباری‘ جلد دوم)

اسی طرح اس عشرہ کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ ؒ فرماتے ہیں:

’’رمضان المبارک کی آخری دس راتیں ذوالحجہ کی پہلی دس راتوں سے افضل ہیں‘ اس لیے کہ اس میں لیلۃ القدر ہے جو تمام راتوں کی سردار ہے۔ اور ذوالحجہ کے پہلے دس دن رمضان المبارک کے آخری دس دنوں سے افضل ہیں‘ کیونکہ ان دنوں میں یومِ عرفہ واقع ہوا ہے جو کہ تمام دنوں میں اشرف وافضل ہے۔‘‘ (مجموع الفتاویٰ)

عشرۂ ذوالحجہ کے اعمال

اس عشرہ کی بے شمار فضیلت اور اہمیت کے بعد اگلی بات ہم نے یہ سمجھنی ہے کہ اس عشرہ میں کون کون سے نیکی کے اعمال کیے جائیں۔ تو نوٹ فرما لیں کہ ان دنوں میں معمول کے اعمال کو

زیادہ خصوصیت اور اہمیت کے ساتھ سرانجام دینا چاہیے۔ مثلاً نمازوں میں خصوصیت کے ساتھ فرائض کے علاوہ نوافل کا اہتمام بقیہ دنوں کے مقابلہ میں زیادہ ہونا چاہیے‘ خاص طور پر تحیۃ الوضوء‘ تحیۃ المسجد‘ اشراق‘ چاشت اور نمازِ تہجد وغیرہ۔ اسی طرح صدقہ وخیرات اور توبہ واستغفار کا بھی خصوصی اہتمام کیا جانا چاہیے۔ گناہوں سے شعوری اور خصوصی طور پر اجتناب ہونا چاہیے۔ ان کے علاوہ روزوں کا اہتمام بھی ہونا چاہیے اور اگر استطاعت ہو تو حج وعمرہ اور قربانی کا اہتمام بھی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت کا اہتمام بھی ہو‘ اگر ساتھ ساتھ ترجمہ وتفسیر کا مطالعہ بھی ہو جائے تو نورٌ علیٰ نور ہو جائے گا۔ نیز کثرت کے ساتھ درود شریف بھی وردِ زباں ہو تو ان شاء اللہ العزیز مفید رہے گا۔ البتہ کچھ اعمال اس عشرہ کے ساتھ خاص ہیں جن کا خصوصیت کے ساتھ احادیث میں ذکر آیا ہے‘ وہ اعمال یہ ہیں:

(۱) تسبیحات وتکبیرات کا اہتمام: عشرہ ذوالحجہ میں کثرت کے ساتھ تسبیحات وتکبیرات نیز ذکر اللہ کی تلقین کی گئی ہے اور اس عمل میں مرد وعورت‘ امام ومقتدی‘ شہری ودیہاتی سب شامل ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَا مِنْ أَيَّامٍ أَعْظَمُ عِنْدَ اللهِ وَلَا أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنَ الْعَمَلِ فِيهِنَّ مِنْ هٰذِهِ الْأَيَّامِ الْعَشْرِ فَأَكْثِرُوْا فِيهِنَّ مِنَ التَّهْلِيلِ وَالتَّكْبِيرِ وَالتَّحْمِيدِ)) (مسند أحمد)

’’کوئی اور دن ایسا نہیں جس میں نیک عمل اللہ کے یہاں ذوالحجہ کے دس دنوں کے عمل سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہوں‘ پس ان ایام میں کثرت سے الحمدللہ‘ لا الٰہ الا اللہ‘ اللہ اکبر اور الحمدللہ کا ورد کیا کرو۔‘‘

ان تکبیرات کا اہتمام کب سے کب تک کیا جائے‘ اس کے بارے میں علماء احناف کہتے ہیں کہ عرفہ کے دن یعنی ۹ ذوالحجہ کی فجر سے ۱۳ ذوالحجہ کی عصر تک ہر فرض نماز کے بعد قدرے بلند آواز سے ایک مرتبہ پڑھنا واجب ہے۔ خواتین آہستہ آواز کے ساتھ پڑھیں گی کہ ان کے لیے بھی یہ واجب ہے۔ اور اکیلے نماز پڑھنے والے حضرات کے لیے بھی یہ واجب ہے۔ خواتین گھر میں نمایاں جگہ پر کارڈ وغیرہ لکھ کر آویزاں کر لیں تاکہ یاد رہے۔ اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک اس کا نہ ہی کوئی متعین وقت ہے اور نہ ہی کوئی متعین تعداد ہے۔ اس عشرہ کے دوران کسی بھی وقت ان کو پڑھا جاسکتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ؒ فرماتے ہیں:

’’حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے اقوال کی رو سے راجح ترین موقف یہ

ہے کہ تکبیرات کا آغاز نو ذوالحجہ کی صبح سے لے کر تیرہ ذوالحجہ کی عصر تک ہے۔''

(فتح الباری' جلد دوم)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام اوقات میں ہر ایک مرد و عورت' صحت مند و بیمار' مسافر و مقیم کے لیے تکبیرات کہنا مستحب ہے۔ امام بخاری لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں بازار کی طرف نکل جاتے اور قدرے اونچی آواز کے ساتھ تکبیرات پڑھتے' پھر لوگ بھی ان کے ساتھ تکبیرات پڑھتے۔

احناف کے نزدیک تکبیراتِ تشریق کے یہ الفاظ افضل ہیں:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اللّٰہُ اَکْبَر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر اللّٰہُ اَکْبَر وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ

(فتح الباری لابن حجر' کتاب العیدین' باب فضل العمل في أيام التشريق)

جبکہ اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک تکبیراتِ تشریق کے یہ الفاظ افضل ہیں:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ بُکْرَۃً وَاَصِیْلًا

(فتح الباری لابن حجر' کتاب الاذان' باب الكلام إذا أقيمت الصلاة)

(۲) بال اور ناخن وغیرہ نہ کاٹنا: جو شخص قربانی کا ارادہ رکھتا ہو اس کے لیے مستحب ہے کہ ذوالحجہ کا چاند دیکھنے سے لے کر قربانی کرنے تک جسم کے کسی حصّہ کے نہ بال کاٹے اور نہ ہی ناخن تراشے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

((إِذَا رَأَيْتُمْ هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ وَ أَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يُضَحِّيَ فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهٖ وَأَظْفَارِهٖ)) (صحيح مسلم)

''جب تم میں سے کوئی ذوالحجہ کا چاند دیکھ لے اور اس کا قربانی کا ارادہ بھی ہو تو اسے چاہیے کہ قربانی کرنے تک اپنے بالوں اور ناخنوں سے رکا رہے۔''

احناف کے نزدیک یہ عمل مستحب ہے' جبکہ حنابلہ اور اہلحدیث حضرات کے نزدیک بال وغیرہ کاٹنا حرام ہے۔ امام شافعیؒ اسے مکروہ تنزیہی کہتے ہیں۔ جو قربانی کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ بھی یہی کرے تو عنداللہ ماجور ہوگا۔ کیونکہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مَیں قربانی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نہ ناخن کاٹو اور نہ بال کاٹو۔ جب لوگ قربانی پیش کر دیں تو تم اپنے ناخن اور بال کاٹ لینا' تمہارے لیے یہی قربانی ہو جائے گی (یعنی تمہیں بھی اس عمل کا اجر مل جائے گا)۔ (سنن ابی داؤد)

(۳) حج و عمرہ کی ادائیگی: عشرہ ذی الحجہ میں حج و عمرہ کی عبادت انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ جس شخص پر حج فرض ہو گیا ہے اسے چاہیے کہ جلد از جلد اس فریضہ سے سبکدوش ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهٗ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ)) (صحيح البخاری)

''ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک درمیان کے (گناہوں) کے لیے کفارہ ہے اور حج مبرور (مقبول حج) کا بدلہ جنّت کے سوا کچھ نہیں۔''

(۴) عشرہ ذی الحجہ کے روزے: اس عشرہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص تاکید ہے کہ ان ایام کو روزوں کے ساتھ گزارا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْ أَيَّامٍ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ أَنْ يُتَعَبَّدَ لَهٗ فِيهَا مِنْ عَشْرِ ذِي الْحِجَّةِ يَعْدِلُ صِيَامُ كُلِّ يَوْمٍ مِنْهَا بِصِيَامِ سَنَةٍ وَقِيَامُ كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْهَا قِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ)) (سنن الترمذی)

''اللہ ربّ العزت کو عشرہ ذی الحجہ میں جتنے نیک اعمال محبوب ہیں اتنے اور کسی دن میں نیک اعمال پسندیدہ نہیں۔ ذوالحجہ کے دنوں کے روزہ کا ثواب سال بھر کے روزوں کے برابر اور ان دنوں کی ایک رات کی عبادت کا ثواب شبِ قدر کی عبادت کے برابر ہے۔''

فقہاء کے نزدیک ذوالحجہ کے ابتدائی آٹھ دن کے روزے رکھنا مستحب عمل ہے اور حدیث میں اس کا بڑا ثواب آیا ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار کام گِنوائے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثرت کے ساتھ کیا کرتے تھے اور ان کو ترک نہیں فرماتے تھے۔ وہ یہ ہیں:

(۱) عاشوراء کا روزہ (۲) ایامِ بیض کے روزے

(۳) عشرہ ذی الحجہ کے روزے (۴) فجر کی سنتیں (سنن نسائی)

الغرض پورے عشرہ ذی الحجہ کے روزے رکھنا علاوہ دس ذوالحجہ کے انتہائی پسندیدہ عمل ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی خصوصی ترغیب دی ہے۔ البتہ یہ روزے نفل ہیں اور ایک نفلی روزہ کا ثواب حدیث میں بہت آیا ہے' چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

((مَنْ صَامَ يَوْمًا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ بَعَّدَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ عَنِ النَّارِ سَبْعِينَ

خَرِيفًا)) (صحيح البخاری)

''جو شخص اللہ ربّ العزت کے لیے ایک نفلی روزہ رکھتا ہے تو اللہ ربّ العزت اُس کے اور جہنّم کے درمیان ستر سال کا فاصلہ ڈال دیتے ہیں۔''

(۵) نو ذُوالحجہ کا روزہ: عرفہ کا دن بڑی فضیلت کا حامل ہے' کیونکہ اس دن تمام حجاج میدانِ عرفات میں جمع ہوتے ہیں اور وقوفِ عرفات حج کا رکنِ اعظم ہے۔ پہلے تذکرہ آچکا کہ اس دن اللہ ربّ العزّت جتنے لوگوں کو جہنّم سے آزادی کا پروانہ جاری فرماتے ہیں اتنے اور کسی دن میں لوگ جہنّم سے چھٹکارا نہیں پاتے۔ اس دن رسول اللہ ﷺ روزہ رکھنے کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ نو ذوالحجہ کا روزہ رکھنا مسنون ہے اور احادیث میں اس دن روزہ رکھنے کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نو ذُوالحجہ کا روزہ مستقل رکھا کرتے تھے' چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

((كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَصُومُ تِسْعَ ذِي الْحِجَّةِ وَيَوْمَ عَاشُورَاءَ وَثَلَاثَةَ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ أَوَّلَ اثْنَيْنِ مِنَ الشَّهْرِ وَالْخَمِيسَ)) (سنن ابی داؤد)

''رسول اللہ ﷺ نو ذی الحجہ' عاشوراء اور ہر مہینے ایام بیض کے روزے رکھا کرتے تھے۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے نو ذُوالحجہ کے روزہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

((صِيَامُ يَوْمِ عَرَفَةَ اِنِّيْ أَحْتَسِبُ عَلَى اللهِ اَنْ يُكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِيْ قَبْلَهُ وَالسَّنَةَ الَّتِيْ بَعْدَهُ)) (صحيح مسلم)

''یومِ عرفہ کے دن روزہ کے بارے میں مجھے اللہ ربّ العزت کی ذات سے اُمید ہے کہ یہ گزشتہ اور آئندہ سال کے گناہوں کا کفّارہ بن جائے گا۔''

خیال رہے کہ یہاں گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔

ایک سوال اور کیا جاتا ہے کہ ۹ ذوالحجہ کون سا والا؟ پاکستان والا یا سعودی عرب والا؟ تو جاننا چاہیے کہ آپ جس مقام پر ہیں اس کا اعتبار ہوگا۔ اللہ کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ بیک وقت ہر جگہ اور ہر وقت اپنی برکات کا نزول فرمائے' وہ زمان و مکان سے پاک ہے۔ جس طرح نماز آپ یہاں کے اوقات کے اعتبار سے پڑھتے ہیں' روزے یہاں کے اعتبار سے رکھتے ہیں' عید یہاں کے اعتبار سے مناتے ہیں' اسی طرح عرفہ کا روزہ بھی اپنے علاقہ کے حساب سے رکھیں گے۔

(۶) نمازِ عید کی ادائیگی: ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ نمازِ عید ادا کرے' کیونکہ یہ واجب ہے اور بچوں کو بھی ساتھ لے کر جائے۔ اس کے بعد خطبہ سننا بھی واجب ہے۔

(۷) قربانی کرنا: دس ذوالحجہ کے دن اللہ ربّ العزت کو قربانی سے زیادہ اور کوئی عمل پسند نہیں ہے۔ جاننا چاہیے کہ بعض دانشور قربانی کے حوالے سے غلط فہمی پھیلاتے ہیں اور اس کی جگہ لوگوں کو فلاح و بہبود کے کاموں کی ترغیب دلاتے ہیں۔ نوٹ کر لیں کہ اس دن قربانی کی جگہ اگر لاکھوں روپے بھی صدقہ و خیرات کر دیے تب بھی وہ عمل قربانی سے افضل نہیں ہوگا۔ اس دن قربانی کا عمل ہی اللہ ربّ العزت کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ باقی رہا صدقہ و خیرات اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کرنا تو وہ ضرور کریں' لیکن قربانی کے بجائے صدقہ و خیرات کے عمل پر پیسہ لگا دینا درست عمل نہیں ہے۔ قربانی کا عمل اپنی جگہ واجب رہے گا' لہٰذا اس کی فکر بھی ہونی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا عَمِلَ آدَمِيٌّ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ أَحَبَّ إِلَى اللهِ مِنْ إِهْرَاقِ الدَّمِ' إِنَّهُ لَيَأْتِي يَوْمَ القِيَامَةِ بِقُرُونِهَا وَأَشْعَارِهَا وَأَظْلَافِهَا' وَأَنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ أَنْ يَقَعَ مِنَ الأَرْضِ' فَطِيبُوا بِهَا نَفْسًا))

(سنن الترمذی)

''قربانی والے دن اللہ ربّ العزت کو جانور کا خون بہانے سے زیادہ کوئی عمل پسند نہیں۔ قیامت کے دن قربانی کے جانور اپنے سینگوں' کھروں اور ناخنوں کے ساتھ لائے جائیں گے۔ قربانی کے جانور کا خون زمین پر گرنے سے پہلے ہی اللہ ربّ العزت کے ہاں قبولیت کا درجہ پا لیتا ہے' لہٰذا خوش دلی کے ساتھ قربانی کیا کرو۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں عشرۂ ذوالحجہ کی فضیلت کو سمجھنے اور ان بابرکت ایام میں مذکورہ بالا تمام اعمال پورے اہتمام کے ساتھ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!!

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت
''پاکستان'' کی ناشکری

مرکزی ناظم تربیت خورشید انجم

کا ۶ مئی ۲۰۲۲ء کا خطابِ جمعہ

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾﴾ (النحل)

قرآن مجید میں مکّی سورتوں کا اہم ترین موضوع ''ایمان'' ہے' یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مطابق ایمان کی دعوت دینے کے لیے قرآن مجید میں دو طرح سے استدلال کیا گیا ہے: تذکیر بالآء اللہ اور تذکیر بایام اللہ۔ تذکیر بالآء اللہ سے مراد ہے: اللہ تعالیٰ کی نعمتیں' اُس کی قدرتیں' اُس کا فضل' اُس کے انعامات اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اُس کی صنّاعی' اس کی خلّاقی اور اُس کے احسانات کے ذریعے سے یاددہانی' جبکہ تذکیر بایام اللہ سے مراد اللہ کے دنوں کے حوالے سے یاددہانی ہے۔ اللہ کے دنوں سے وہ اہم اور عبرت ناک دن مراد ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی قوموں کو تہس نہس کر دیا۔

درج بالا آیات سورۃ النحل کی ہیں۔ سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور پھر لوگوں کو ان کی طرف توجّہ دلا کر کہا ہے کہ ان پر غور و فکر کرو' تمہیں اللہ کی معرفت حاصل ہوگی۔ نحل کے معنی ہیں ''شہد کی مکھی''۔ یعنی شہد کی مکھی کو دیکھو کہ جس کا چھتّا انجینئرنگ کا شاہکار ہے اور یہ جو شہد تیار کرتی ہے اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ پھر دودھ کی پیدائش کو

دیکھو کہ گائے بھینس کے پیٹ میں ایک طرف خون ہے اور ایک طرف گوبر' لیکن اس کے باوجود دودھ میں کوئی بساند نہیں' کوئی بُو نہیں۔ اگر فریج میں کوئی بُو والی چیز رکھ دی جائے جیسے مچھلی وغیرہ تو وہاں موجود ساری چیزوں کے اندر بُو رچ بس کر رہ جاتی ہے۔ یہاں خون اور گوبر کے ساتھ ساتھ دودھ بہہ رہا ہے لیکن کوئی ہلکی سی بھی بساند محسوس نہیں ہوتی ہے۔ سورۃ النحل میں ان کے علاوہ اور بھی بہت سی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسی سورہ مبارکہ میں آگے چل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ آیا ہے —— حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ قرآن مجید میں کئی مرتبہ آیا ہے اور بار بار فرمایا گیا کہ وہ ''حنیف'' یعنی اللہ کی عبادت میں یکسو تھے اور ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾ ''اور مشرکین میں سے ہرگز نہیں تھے۔'' البتہ یہاں ایک دوسرا انداز ہے۔ فرمایا:

﴿شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾﴾

''وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے۔ اللہ نے انہیں چن لیا تھا اور سیدھے راستے کی طرف ان کو ہدایت دی تھی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی نعمتوں کا بیان اور اس پر شکر کی روش اس سورۂ مبارکہ کا خاص اور اصل مضمون ہے۔

اسی حوالے سے اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۱۲ میں ایک بستی کی مثال دے کر ہماری تذکیر کی گئی ہے۔ آج کی نشست میں ہم اس آیت کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً﴾

''اور اللہ تعالیٰ مثال بیان کرتے ہیں ایک بستی کی''

﴿كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً﴾

''جو بہت امن و امان اور اطمینان سے رہ رہی تھی''

یعنی اس بستی کے رہنے والوں کو امن کی کیفیت بھی حاصل تھی اور اطمینان و سکون کی بھی۔ دوسری نعمت جو انہیں حاصل تھی وہ یہ کہ:

﴿يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ﴾

''ہر طرف سے اُن کا رزق چلا آ رہا تھا''

فراغت کے ساتھ کھلا رزق آ رہا تھا' یعنی وہ قوم معاشی لحاظ سے بہت خوشحال تھی۔ آج کی اصطلاح میں ان کی فی کس آمدنی بہت زیادہ تھی اور ہر قسم کا آرام و آسائش بھی ان کو حاصل تھا۔ یہ دو بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ کسی ملک کے اندر اگر امن و امان ہو اور رزق کی فراوانی بھی ہو تو پھر اور کیا چاہیے! لیکن ہوا یہ کہ:

﴿فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ﴾

''انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی''

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اتنی بڑی نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے' لیکن انہوں نے کفرانِ نعمت یعنی ناشکری کی رَوِش اختیار کی۔

﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾

''تو اللہ نے ان کو مزہ چکھایا بھوک اور خوف کے لباس کا''

یعنی اللہ ربّ العزت نے ان پر بھوک اور خوف مسلط کر دیا۔ امن و امان کی جگہ خوف اور رزق کی فراوانی کی جگہ بھوک کا لباس انہیں پہنا دیا۔

﴿بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾

''بسبب اس کے کہ جو کرتوت وہ کیا کرتے تھے۔''

یَصْنَعُوْنَ سے صنعت کا لفظ ہے بمعنی کچھ کاری گری کرنا' کچھ بنانا۔ اسی سے مصنوعات کا لفظ بھی آتا ہے۔ تو وہ جو کچھ کیا کرتے تھے اس کے عوض ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا۔ یعنی انہیں ان کے کرتوتوں کا بدلہ دیا گیا۔ اگلی آیت میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ﴾

''اور یقیناً اُن کے پاس ایک رسول ان ہی میں سے آیا تھا''

﴿فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾﴾

''تو انہوں نے اس کو جھٹلایا' پس آن پکڑا اللہ کے عذاب نے ان کو اس حال میں کہ وہ (اپنی جانوں پر) ظلم کرنے والے تھے۔''

سورۃ سبا میں بھی اسی طرح کا ایک اور سابقہ قوم کی ناشکری کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا' کس طرح سے انہوں نے ناشکری کی رَوِش اختیار کی اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیسا سلوک فرمایا! ارشاد ہوا:

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ﴾

''یقیناً قومِ سبا کی بستی میں بھی ایک نشانی ہے۔''

یہ یمن کے علاقے کی قوم تھی۔ ملکہ سبا کا تعلق بھی اسی قوم سے تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں آئی تھیں اور ان پر ایمان بھی لے آئی تھیں۔ یہ پورا قصہ قرآن کے اندر موجود ہے۔

﴿جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ؕ﴾

''ان کے دو باغ تھے دائیں اور بائیں طرف''

میلوں تک وہ باغ پھیلے ہوئے تھے۔ یعنی زراعت تھی' کھیتی باڑی تھی۔ گویا ان کے پاس ہر قسم کے وسائل موجود تھے اور شمالاً جنوباً ہر طرف باغات ہی باغات تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

﴿كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ﴾

''کھاؤ اور پیو اپنے رب کا رزق اور اُس کا شکر ادا کرو۔''

﴿بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾﴾

''یقیناً (یہ) ایک پاکیزہ شہر ہے اور تمہارا رب بھی بخشنے والا ہے۔''

اس احسانِ الٰہی پر ان کا رویّہ یہ تھا کہ:

﴿فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾﴾

''تو انہوں نے اعراض کیا' چنانچہ ہم نے بھیج دیا اُن پر سیلاب بہت زور کا اور ہم نے بدل دیے اُن کے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ' جن میں کڑوے کسیلے پھل' جھاؤ کے درخت اور کچھ تھوڑی سی بیریاں تھیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ان پر اس زور کا سیلاب بھیجا کہ پانی ذخیرہ کرنے کے لیے بنایا ہوا بند ٹوٹ گیا' جس کے نتیجے میں ان کی بستیاں برباد ہو گئیں اور وہ دونوں سرسبز و شاداب باغ اجڑ گئے اور ان باغوں کو ایسے دو باغوں سے بدل دیا جن میں کچھ میلا کسیلا سا پھل آتا تھا۔ کچھ جھاؤ جھنکاڑ تھے اور کچھ تھوڑی سی مقدار کے اندر بیر ہوا کرتے تھے۔ ایسا کیوں ہوا' اس کے بارے میں اللہ ربّ العزت نے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ﴾

''ہم نے ان کو یہ بدلہ دیا بوجہ اس کے جو انہوں نے ناشکری کی روش اختیار کی تھی۔''

﴿وَهَلۡ نُجٰزِیۡۤ اِلَّا الۡکَفُوۡرَ ﴿۱۷﴾﴾

''اور جو ناشکری کی روش اختیار کرتے ہیں ان کو ہم یہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔''

قومِ سبا پر جب سیلاب آیا تو وہ تتر بتر ہوگئی۔ انہی میں سے دو قبائل اوس اور خزرج بھی تھے جو یمن سے نکل کر مدینہ منورہ آکر آباد ہوگئے تھے۔ اس قوم کو جزیرہ نمائے عرب پر تجارت کی اجارہ داری حاصل تھی۔ شام سے یمن تک کی تجارتی شاہراہ قومِ سبا کے پاس تھی۔ اس قوم کے بعد یہی چیز قریش کو حاصل ہوئی جس کا تذکرہ سورۂ قریش میں ہے۔ فرمایا:

﴿لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ ﴿۲﴾ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ وَّاٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾﴾

''قریش کے مانوس رکھنے کی وجہ سے (یعنی) سردیوں اور گرمیوں کے سفر سے ان کو مانوس رکھنے کی وجہ سے۔ پس انہیں بندگی کرنی چاہیے اس گھر کے رب کی جس نے انہیں بھوک میں کھانے کو دیا اور انہیں خوف سے امن عطا کیا۔''

حضورِ اُقدس ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب میں قتل و غارت کا بازار گرم رہتا تھا۔ کوئی شخص آزادی اور امن کے ساتھ سفر نہیں کرسکتا تھا۔ قریش کا قبیلہ بیت اللہ کے پاس رہتا تھا اور اس کا انتظام و انصرام انہی کے پاس تھا۔ عرب کے ہر قبیلے کے خدا کا بُت خانہ کعبہ میں رکھا ہوا تھا' جن کی کُل تعداد ۳۶۰ تھی۔ قریش بیت اللہ کی خدمت بھی کرتے تھے' لہٰذا سارے عرب کے لوگ ان کی عزّت کرتے تھے اور جب وہ سفر کرتے تو انہیں کوئی نہیں لوٹتا تھا۔ اسی وجہ سے قریش کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنی تجارت کی خاطر سردیوں میں یمن اور گرمیوں میں شام کا سفر کیا کرتے تھے۔ اسی تجارت سے ان کا روزگار وابستہ تھا' کیونکہ مکہ تو سنگلاخ زمین تھی اور وہاں کوئی پیداوار نہیں ہوتی تھی۔ انہی اسفار کی وجہ سے وہ خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ بیت اللہ کی مجاوری کی وجہ سے انہیں امن' چین اور سکون بھی حاصل تھا۔ لہٰذا اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ قریش کو یاد دلا رہے ہیں کہ انہیں عرب میں جو عزّت حاصل ہے اور جو امن' چین' سکون' خوشحالی میسّر ہے اس پر شکر گزاری کی رَوِش اختیار کریں اور اللہ ہی کی عبادت کریں۔ ابھی جن اقوام کا تذکرہ ہوا' ان کے ذریعے دراصل ہمیں یاددہانی کرائی جارہی ہے۔ جیسا کہ سورۃ الانبیاء میں فرمایا گیا:

﴿لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ کِتٰبًا فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰﴾﴾

''یقیناً یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر بھی ہے۔ تو تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے!''

قرآن مجید دراصل ہمیں بھی سمجھا رہا ہے کہ اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھو کہ تم کہاں کھڑے ہو' تمہاری کیفیت کیا ہے؟ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم غور و فکر کریں تو ہمارا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے' اِلّا ماشاء اللہ۔

نبی اکرم ﷺ اپنی حیاتِ طیبہ میں اس دین کو جزیرہ نمائے عرب پر غالب اور نافذ کرکے اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ (الصف)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ' تاکہ غالب کردے اس کو تمام کے تمام ادیان پر اور خواہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

پھر غلبۂ دین کی تکمیلی شان ہمیں دورِ فاروقی اور دورِ عثمانی میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد بھی غلبۂ دین کی جِدّوجُہد اور فتوحات جاری رہیں' یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بنوعباس کے دور میں پھر وہی کفرانِ نعمت کی روش اختیار کرلی گئی۔ اب کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ ؎

مَیں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل' طاؤس و رُباب آخر!

وہ سب نام کے تو خلیفہ تھے لیکن ان کے رنگ ڈھنگ قیصر و کسریٰ والے تھے۔ اسی طرح سے حرم آباد ہوئے' اسی طرح سے راگ و رنگ کی محفلیں جمنی شروع ہوگئیں۔ وہی بادشاہوں کے رنگ ڈھنگ' وہی سونے چاندی کے پیالوں میں کھانا پینا شروع ہوگیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک انتہائی وحشی قوم یعنی تاتاریوں کو بھیج دیا۔ ان کی بربریت کا یہ عالَم تھا کہ مسلمانوں کے قتل سے بغداد کی گلیاں خون سے بھر گئیں اور انہوں نے کھوپڑیوں کے مینار بنادیے۔ مسلمانوں پر اس حد تک ان کی وحشت طاری تھی کہ اگر ایک نہتا تاتاری کچھ لوگوں سے کہتا کہ تم یہیں کھڑے رہو' ہلنا نہیں! مَیں ابھی تلوار لے کر آتا ہوں اور تمہارا سر قلم کرتا ہوں تو وہ خوف کے مارے واقعی وہاں

سے ہلتے تک نہیں تھے۔ یہ کیفیت ہوگئی تھی مسلمانوں کی۔

ہمارے ہاں ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا بھی یہی حال رہا اور پھر ان کا بھی وہی معاملہ ہوا۔ محمد شاہ رنگیلا جیسی شخصیات آ گئیں۔ جب نادر شاہ دہلی کی طرف منزل پر منزل طے کرتا آ رہا تھا تو اطلاع کا جو پرچہ بھی آتا تھا' محمد شاہ اسے شراب کے پیالے میں ڈبو کر کہتا تھا: ''ہنوز دلی دوراست!'' پنڈی پہنچ گیا' ہنوز دلی دوراست! لاہور پہنچ گیا' ہنوز دلی دوراست! امرتسر پہنچ گیا' ہنوز دلی دوراست! بالآخر وہ دلی بھی پہنچ گیا اور پھر اس نے دہلی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا' لیکن ہمیں پھر بھی کوئی عقل نہیں آئی۔ اس کے بعد تقریباً دو سو سال تک ہم پر انگریزوں کی غلامی کا دور مسلّط رہا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ہم پر مہربانی کی اور پاکستان کے لیے تحریک چلائی گئی۔ تحریکِ پاکستان کی بنیاد ہندو کا خوف تھا کہ انگریز کے جانے کے بعد وہ ہم سے ہزار سالہ شکست کا انتقام لے گا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے وقت اندرا گاندھی کے منہ سے یہ الفاظ بھی نکل گئے تھے کہ ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لے لیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پاکستان جیسی نعمت ہمیں عطا کر دی۔ کس لیے؟ چونکہ ہم نے کہا تھا کہ ہمارا دین خطرے میں ہے' ہماری تہذیب خطرے میں ہے' ہماری ثقافت خطرے میں ہے۔ ہندو اکثریت میں ہے' انگریز کے جانے کے بعد تو ہندو چھا جائے گا۔ لہٰذا ہمیں ایک علیحدہ خطہ چاہیے جہاں ہم آزادی سے اپنے دین پر عمل کر سکیں۔ علّامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء کے خطبہ میں یہی بات کہی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ہماری دعا نہ صرف قبول کی بلکہ ہمیں دو پاکستان عطا کر دیے۔ ایک مشرقی پاکستان اور ایک یہ موجودہ مغربی پاکستان۔ لیکن پھر ہوا کیا؟ ہم نے بھی وہی کچھ کیا جو قومِ سبا نے کیا تھا: ﴿فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ﴾ ''انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی'' تو ہم نے بھی اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی ہے۔ جب وعدہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ وہ چیز عطا فرما دیتے ہیں' جیسا کہ سورۃ التوبہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۷۵﴾

''اور ان میں کچھ وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر ہمیں اپنے فضل سے

دے گا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور ہم ضرور بھلے آدمی ہو جائیں گے۔''

کیا ہم نے بھی یہی وعدہ نہیں کیا تھا کہ اے اللہ! ایک بار ہمیں ایک علیحدہ خطہ عطا کر دے' ہم نیکوکاروں میں ہوں گے' ہم تیرے دین کے عادلانہ نظام کو قائم کر کے دکھائیں گے' ہم اسلام کا نظامِ حریت و اخوت و مساوات قائم کریں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جب ہمیں ایک کے بجائے دو خطے عطا کر دیے' ہر طرح کی سہولیات عطا کر دیں' بافراغت رزق ہمارے پاس تھا — انڈیا سے جب کوئی پاکستان آتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ ایک غریب ملک سے خوشحال ملک میں آ گئے ہیں — لیکن ہمارا طرزِ عمل اور ہمارا رویہ مسلسل ناشکری کا رہا۔ اسی دین سے ہم نے اعراض کیا جس کو قائم کرنے کا وعدہ کر کے ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ قرار دادِ مقاصد منظور ہوئی تو پارلیمنٹ کے اندر کہا گیا کہ آج ہمارے سر شرم سے جھک گئے ہیں کہ عوامی حاکمیت کے دور میں اللہ کی حاکمیت کا اقرار ع

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!

No legislation will be done repugnant to The Quran and The Sunnah!

ہماری باقی ساری تاریخ بھی اسی طرح کی ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ سزا کے طور پر ۱۹۷۱ء میں ہمارے اوپر عذاب کا کوڑا برسا اور مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے ''مشرقی پاکستان'' نام رکھنا بھی گوارا نہیں کیا جبکہ دنیا میں اُس وقت دو جرمنی تھے اور دو کوریا تو اب بھی ہیں۔ پاکستان بھی دو ہو سکتے تھے: مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔ لیکن ان بنگالیوں کے دلوں میں ہمارے خلاف ایسی نفرت تھی کہ انہوں نے نام میں پاکستان کا لفظ بھی گوارا نہیں کیا۔ ہمارے ترانوے ہزار کڑیل جوان ہندو کی قید میں گئے۔ پوری اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے اس کی مثال نہیں ملتی۔ شہید تو ہوئے ہیں لیکن اتنی بڑی تعداد میں قیدی کبھی بھی نہیں ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا تھا جو ہم پر برسا ہے اور اس کی وجہ فقط ''اعراض عن الدّین'' ہے کہ اس دین سے ہم نے اعراض کی روش اختیار کی۔ اس کے بعد بھی ہماری روش نہیں بدلی اور اب بگاڑ بڑھتے بڑھتے جس حد تک پہنچ گیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ گالی دینا تو ہمارا کلچر ہے۔ کرپشن کے الزام سے کوئی بھی بری نہیں۔ عوام ہوں یا حکام' اس حمام میں سب ننگے ہیں۔

حال ہی میں امیر تنظیم اسلامی محترم شجاع الدین شیخ صاحب نے اپنے ایک بیان میں جب کہ جناب مفتی تقی عثمانی صاحب نے عید کے خطبہ میں اس جانب توجّہ دلائی ہے کہ ہماری سیاست کے اندر بگاڑ بہت بڑھ گیا ہے۔ خدارا! سیاسی اختلاف کو حق و باطل کا معرکہ نہ بنائیں! مروّجہ سیاست میں یہ بگاڑ ویسے تو کئی دہائیوں سے چلا آ رہا ہے‘ لیکن اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا ہے۔ گالیاں دینا اور غیبت کرنا تو ایک معمول سا بن گیا ہے۔ ہلڑ بازی‘ جلسوں میں میراثیوں اور گویوں کو کھڑا کر دینا‘ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا‘ الزام تراشی‘ بہتان طرازی‘ کردار کشی‘ یہ ہماری سیاست کے سنگ ہائے میل بن چکے ہیں۔ اس کو معیوب سمجھا ہی نہیں جاتا‘ حالانکہ یہ برائیاں تو کبیرہ گناہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں۔ دوسروں کی عزّت سے کھیلنا گناہِ کبیرہ ہے جو سرِعام ہو رہا ہے۔ پھر رمضان میں نمازوں کے اوقات میں جلسے منعقد کیے جاتے رہے۔ اب معاملہ بڑھتے بڑھتے کس درجہ کو پہنچ گیا ہے‘ اسے واضح کرنے کے لیے درج ذیل واقعات کا حوالہ کافی ہے:

(۱) رمضان المبارک میں تیمر گرہ میں ایک مسجد پر حملہ کر دیا گیا۔ مقتدیوں کو مارا گیا اور امام کو زخمی کیا گیا۔ بعد میں وہاں جماعت اسلامی کے امیر نے جرگہ کیا اور سب کو بلا کر عہد لیا کہ آئندہ آپس میں امن سے رہیں گے۔

(۲) ہری پور میں دو مزدوروں کی کسی بات پر تکرار ہوئی‘ ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔

(۳) چند دن پہلے کی بات ہے کہ ایک نوجوان لڑکے کے کزن اور کسی شخص کی آپس میں تُو تکار بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھی کہ وہ لڑکا چھڑانے گیا تو اس کو قتل کر دیا گیا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ مولویوں میں برداشت نہیں‘ لیکن یہ عدم برداشت کس طرف سے ہو رہا ہے؟ مَیں کسی پارٹی کا نام نہیں لے رہا‘ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ سیاست دان لوگوں کو بھڑکا رہے ہیں اور عوام اس چکّی میں پِس رہے ہیں‘ جبکہ لیڈر خود آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جس دن سے قومی اسمبلی میں عدم اعتماد کی تحریک کامیاب ہوئی ہے‘ مخالفین آرام سے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لگا رہے ہیں۔ ایک بھائی حزبِ اقتدار میں ہے تو دوسرا حزبِ اختلاف میں۔ والدہ ایک جماعت میں تو بیٹی دوسری میں۔ ان کی تو آپس میں رشتہ داریاں ہیں جن میں یہ گندھے ہوئے ہیں۔ ان کو تو کوئی مسئلہ ہی نہیں‘ ان کے تو آپس میں ڈنر چل رہے ہیں۔

اسی صورت حال پر اکبرالٰہ آبادی نے بڑے ظریفانہ انداز میں کہا تھا کہ ؎

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ!

یہ تو وہی کیفیت نظر آتی ہے جو سورۃ الانعام کی آیت ۶۵ میں بیان کی گئی:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝۶۵﴾

”کہہ دیجیے کہ وہ قادر ہے اس پر کہ تم پر بھیج دے کوئی عذاب تمہارے اوپر سے یا تمہارے (قدموں کے) نیچے سے یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور ایک کی طاقت کا مزا دوسرے کو چکھائے۔ دیکھو کس کس طرح ہم اپنی آیات کی تصریف کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں!“

یہ کیفیت ہے جو اس وقت ہماری ہو رہی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو مزہ چکھانے کے چکر میں ہیں اور گروہ بندی حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر کوئی کہہ رہا ہے کہ مَیں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔ غداری کے فتوے عام ہو گئے ہیں۔ اسی طرح امن و امان کی کیفیت ابتر سے ابتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں بم دھماکا ہو یا بلوچستان اور وزیرستان کی صورتحال‘ اکثر اوقات تو اصل حالات ہمارے سامنے آتے ہی نہیں ہیں۔ جو کچھ ہمارے پاس پہنچتا ہے یہ تو چھلنی سے نکل کر آتا ہے۔ ڈالر کی اڑان ہے کہ کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی اور پٹرول عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے چنگل میں ہم اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ اب پھڑ پھڑانے اور ہلنے کی بھی سکت ہم میں نہیں رہی۔ اخلاقی لحاظ سے صورت حال اتنی آگے نکل چکی ہے کہ لگتا ہے جیسے صحت‘ تعلیم‘ خوراک‘ روزگار اور بنیادی ضروریات جیسے مسائل حل ہو چکے ہیں‘ بس اب ویڈیوز ہیں جو اِدھر سے اُدھر ہونا باقی رہ گئی ہیں۔ یہ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ جہاں تک ہم پہنچے ہوئے ہیں۔

اس ساری صورتِ حال کی بنیادی وجہ اس وعدے کی خلاف ورزی ہے جو قیامِ پاکستان کے موقع پر بحیثیت قوم ہم سب نے اللہ سے کیا تھا۔ یہ خلاف ورزی ہم مسلسل کرتے جا رہے

ہیں۔ کہاں ہے وہ اسلام جس پر عمل کرنے کا کا وعدہ کر کے ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا؟ بقول شاعر:ؔ

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے!

ہم نے اپنی ہی صورت بگاڑ لی ہے‘ اپنا چہرہ ہی مسخ کر بیٹھے ہیں۔ اسی جذباتیت‘ دوسروں کے لیے حقارت آمیز رویوں اور گالم گلوچ کی وجہ سے آدھا ملک ہم ۱۹۷۱ء میں گنوا بیٹھے ہیں۔ اب آدھا رہ گیا ہے‘ اس کی تو حفاظت کر لی جائے!

سوال یہ ہے کہ اس صورت حال سے نجات کیسے حاصل کریں؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اس کا واحد راستہ ہے ’’توبہ‘‘! جو کچھ ہو چکا‘ سو ہو چکا۔ اب اس سے واپس پلٹا جائے۔ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ)) (سنن ابن ماجه) کہ گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ ہمیں اپنے اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ اپنے آپ کو ٹٹولیں کہ ہم کتنے مسلمان ہیں! کیا اپنے پانچ چھ فٹ کے وجود پر مَیں نے اسلام کو نافذ کیا کہ نہیں؟ اگر کیا ہے تو کتنے فیصد کیا ہے؟ اور جو نافذ کیا ہے‘ کیا وہ بھی صرف اپنی پسند کا دین تو نہیں ہے کہ جو آسان لگا کر لیا‘ ذرا سا مشکل اور ناپسند لگا تو چھوڑ دیا۔ اس حوالے سے قرآن حکیم کا تقاضا ہے کہ دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠﴾ (البقرۃ:۲۰۸)

’’اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!‘‘

کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی اور اس کے بعد جو میرا دائرۂ اختیار ہے‘ اس کے اندر بھی شریعت کا نفاذ ہو۔ اس انفرادی توبہ کے ساتھ اجتماعی توبہ بھی ہو تو مکمل توبہ ہو گی‘ جیسا کہ قومِ یونس نے گڑگڑا کر اللہ کے حضور توبہ کی تھی۔ ان کی اجتماعی توبہ قبول بھی ہو گئی تھی اور عذابِ الٰہی کے آثار نظر آنے کے بعد بھی وہ عذاب ان سے ہٹا لیا گیا تھا۔ اگر ہمیں بھی اللہ کے عذاب سے بچنا ہے تو یہی روش اختیار کرنا ہو گی۔ اجتماعی توبہ کرتے ہوئے اپنے اس وعدے کو پورا کرنا ہو گا جو قیامِ پاکستان کے وقت ہمارے بڑوں نے اللہ سے کیا تھا کہ اس ملک میں دین کا نفاذ ہو‘ اسلام کا بول بالا ہو جائے۔ لہٰذا اس دین کے نفاذ اور قیام کے لیے عملی جِدّوجُہد کی

جائے۔ ہم اپنے تن من دھن کو اس عظیم کام کے لیے وقف کریں اور یہ کہہ سکیں کہ ؎

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
مَیں اسی لیے مسلماں‘ مَیں اسی لیے نمازی!

اگر واقعتاً ہم نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ ہے نجات کی واحد راہ! ورنہ اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے اور فرماتا ہے کہ:

﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝۳۸﴾ (محمد)

’’اللہ بے نیاز ہے اور تم سب محتاج۔ اور اگر تم منہ پھیرو تو وہ تمہارے سوا اور لوگ بدل لے گا‘ پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی سُنّت نہیں کہ وہ کسی خاص قوم کو بار بار موقع عطا کرتا رہے‘ بلکہ وہ تمہیں ہٹا کر کسی اور کو توبہ کی توفیق عطا فرما دے گا اور پھر وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔

آج ہمارے لیے سوچنے کا یہ مقام ہے کہ ہم اس رَوِش کو چھوڑ کر اللہ کی طرف پلٹ آئیں۔ کیا عجب کہ ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۴۹) ’’کتنی ہی تھوڑی تعداد والی جماعتیں زیادہ تعداد والی پر اللہ کے حکم سے غالب آ گئیں۔‘‘ کے مصداق اللہ تعالیٰ ہم سے ہی اپنے دین کے غلبہ کا کام لے لے۔ اللہ تعالیٰ ایسی چھوٹی چھوٹی جمعیتوں سے ہی اپنے دین کا کام لے لیتا ہے۔ لہٰذا اپنے رویّوں پر نظرثانی کرتے ہوئے اس عظیم کام کے لیے کمر ہمت کسیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اس خاص کام کے لیے اس اُمّت کو چنا ہے‘ اللہ کرے ہم اس چناؤ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!! ❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

مسلمانوں کے قرآن مجید سے بُعد اور بیگانگی کے اسباب

از قلم: پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ

یہ فکر انگیز مقالہ چشتی صاحب مرحوم نے ۱۹۷۶ء میں مرکزی انجمن خُدّام القرآن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تیسری سالانہ قرآن کانفرنس کے موقع پر پیش فرمایا تھا' جسے ماہنامہ 'حکمتِ قرآن' ستمبر ۱۹۹۴ء میں شائع کیا گیا۔ اب اس گراں قدر مقالے کی 'میثاق' میں اشاعت کے موقع پر قارئین کی سہولت کے لیے فارسی اشعار کا ترجمہ بھی شامل کیا جا رہا ہے۔

آریائی ذہن تصوّراتی (speculative) اور سامی ذہن عملی (practical) ہے۔ یونان' ایران اور ہندوستان' تینوں ملک فلسفہ وحکمت کا منبع تھے۔ لیکن اللہ کی حکمتِ بالغہ نے اپنے آخری اور کامل پیغامِ ہدایت کے لیے عرب کی زمین کو منتخب کیا جو منطق' فلسفہ اور حکمت کے اثرات سے پاک تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن درسِ فلسفہ پر عملِ صالح اور جہاد کو ترجیح دیتا ہے۔ واضح ہو کہ قرآن حکمت کا منکر یا اس کا دشمن نہیں ہے' بات صرف اتنی ہے کہ وہ بقولِ اقبال تصوّرات کے مقابلے میں عمل پر زیادہ زور دیتا ہے۔ (Emphasises deed rather than idea)

قرآن صرف ایک اخلاقی نظام نہیں بلکہ کامل دستورِ حیات ہے اور اسے نافذ کرنے کے لیے متکلمین کے بجائے مجاہدین کی ضرورت ہے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ منطق' فلسفہ اور کلام میں انہماک سے انسان کی عملی قوت (جو

شرطِ جہاد ہے) بالکل افسردہ بلکہ مردہ ہو جاتی ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے:

(۱) ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصّف)

''اللہ چاہتا ہے اُن لوگوں کو جو لڑتے ہیں اُس کی راہ میں صف باندھ کر گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔''

(۲) ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۟﴾ (التوبۃ:۱۱۱)

''اللہ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال اس قیمت پر کہ اُن کے لیے جنّت ہے۔ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں' پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔''

مگر کسی منطقی یا فلسفی نے آج تک اپنی جان اللہ کے ہاتھ نہیں بیچی۔ اس لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کے لیے ایسی قوم کو منتخب کیا جو منطق' فلسفہ اور کلام تینوں علومِ ''آلیہ'' سے بیگانہ تھی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے کلمہ حق کو بلند کرنے کے لیے مجاہد درکار تھے نہ کہ منطقی۔ وہ ایسے آدمی چاہتا تھا کہ جو ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' کا مصداق ہوں تاکہ وہ اللہ کے قانون کو بلا چون و چرا نافذ کر سکیں اور جب کوئی ان سے پوچھے کہ میاں تم ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو؟ کیا مقصد ہے؟ تو وہ یہ جواب دیں جو قیامت تک یادگار رہے گا: ہم خود نہیں آئے ہیں بلکہ ''اِنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَهَالَةِ وَجَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰى نُوْرِ الْاِيْمَانِ وَعَدْلِ الْاِسْلَامِ'' (ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں اور بادشاہوں کے ظلم سے نکال کر ایمان کی روشنی اور اسلام کے عدل وانصاف کی طرف لے آئیں۔)

قصہ مختصر' قرآن نے ان سے کہا:

(۱) تمہاری دنیا کی زندگی دراصل دھوکے کی پونجی ہے۔ یہ حقیقی (Real) نہیں ہے۔ حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد شروع ہوگی' لہٰذا اس کے حصول کے لیے کوشش کرو۔ ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۴﴾ (العنکبوت)

(۲) یہ زندگی اُن کو ملے گی جو دین الحق کی نشر واشاعت میں اپنی جان کھپائیں گے اور اپنی دولت خرچ کریں گے اور اللہ کو اپنا محبوب بنائیں گے۔

الغرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ۲۳ سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی بحث نہیں کی' نہ منطقی'

نہ کلامی‘ نہ سائنسی‘ نہ فلسفیانہ۔ مثلاً: (۱) نہ بحثِ ذات وصفات (۲) نہ بحثِ خیر وشر (۳) نہ بحثِ جبر واختیار (۴) نہ بحثِ حدوث وقدمِ عالم (۵) نہ بحثِ حشر اجساد (۶) نہ بحثِ وزنِ اعمال (۷) نہ کیفیتِ رؤیتِ باری تعالیٰ (۸) نہ کیفیتِ جنّت ودوزخ (۹) نہ کیفیتِ وحی (۱۰) نہ ماہیتِ نفس ناطقہ (۱۱) نہ ماہیتِ روح (۱۲) اور نہ چگونگی اتصالِ نفس ناطقہ باجسم انسانی یا کیفیتِ انفصالِ نفسِ ناطقہ ازجسم۔

یہی بارہ بنیادی سوال ہیں جو تین ہزار سال سے استخوانِ نزاع بنے ہوئے ہیں اور قیامت تک بنے رہیں گے‘ کیونکہ ؎

انکشافِ رازِ ہستی عقل سے ممکن نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے!

اسی لیے حافظ شیرازی نے ہمیں مشورہ دیا تھا ؎

حدیث از مطرب ومے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را!

[مغنّی اور شراب کی بات کر اور زمانے کا راز کم تلاش کر۔ اس لیے کہ دانائی سے کسی نے نہ تو یہ معمہ کھولا ہے اور نہ ہی کھولے گا۔]

قرآنِ حکیم نے اپنی تعلیمات کی بنا پر ساری دنیا سے جنگ مول لے لی: (۱) سب سے پہلے مشرکوں کو ختم کیا (۲) پھر یہود کو زیر کیا بلکہ ختم کر دیا (۳) پھر نصاریٰ کو محکوم بنایا اور دونوں کو خارج البلد کر دیا۔ (۴) پھر عراق اور ایران کو فتح کیا‘ اور مجوسیت‘ مزدکیت اور مانویت کو ختم کر دیا۔ (۵) پھر شام اور ارضِ روم اور ایشائے کوچک کو فتح کیا اور نصرانیت اور انسان پرستی کو ختم کیا۔

گویا حسبِ ذیل اقوام کو اپنا جانی دشمن بنالیا: (۱) بُت پرست (۲) ستارہ پرست (۳) آفتاب پرست (۴) انسان پرست (۵) مجوسی (۶) مزدکی (۷) مانوی (۸) یہودی (۹) عیسائی — دوسرے لفظوں میں اسلام نے پہلی صدی ہجری ہی میں ساری دنیا کو اپنا دشمن بنالیا۔

---

(۱) انتقامِ یہود

یہودی قوم نے انتقام میں سبقت کی۔ ۳۰ھ میں عبداللہ بن سبا یہودی منافقانہ طور پر اسلام لایا اور اس نے مسلمانوں کو خدا پرستی کے بجائے شخص (انسان) پرستی کی تعلیم دی۔ اس

طرح اسلام میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہو گیا جس نے قرآن کے بجائے ایک خاندان کو‘ اور اللہ کے بجائے ایک شخص کو اپنا محبوب اور مطلوب بنالیا۔ اس طرح ایک فرقہ بندی بھی پیدا کر دی جس سے اللہ تعالیٰ نے اجتناب کا حکم دیا تھا‘ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝٣١ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝٣٢﴾ (الروم)

’’اور مت ہو شرک کرنے والوں میں۔ جنہوں نے کہ پھوٹ ڈالی اپنے دین میں اور ہو گئے ان میں بہت فرقے۔ ہر فرقہ جو اُس کے پاس ہے اس پر فریفتہ ہے۔‘‘

مزید برآں اس فرقے کی توجّہ قرآن سے ہٹ کر چند افراد پر مبذول ہو گئی اور اس نے جہاد کے بجائے رنج وغم کو اپنا شعارِ حیات اور امتیازی نشان بنالیا۔ حالانکہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ رنج وغم تین دن سے زیادہ مت کرو‘ مگر ہم (یعنی نہ صرف وہ فرقہ بلکہ اُمّت کے سوادِ اعظم کی بھی بڑی تعداد) اس کارِ خیر میں مصروف ہیں اور اللہ کے فضل سے ہر سال اس کی کمیت اور کیفیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

(۲) انتقامِ ایران

یہود کی کامیابی کے بعد ایران نے انتقام کا سلسلہ شروع کیا۔ طرفہ قیامت یہ ہو گئی کہ جوں جوں ایرانی انتقام میں شدید ہوتے چلے گئے مسلمان اندرونی خلفشار کی وجہ سے‘ جو عبداللہ بن سبا نے پیدا کر دیا تھا‘ تمسّک بالقرآن میں ضعیف ہوتے چلے گئے۔

یہود نے انتقام اس طرح لیا کہ مسلمانوں کی توجّہ قرآن کے بجائے چند اشخاص کی طرف مبذول کر دی اور ایرانیوں نے اس طرح کہ مسلمانوں کی توجّہ قرآن کے بجائے فلسفیانہ اور کلامی مسائل کی طرف منعطف کر دی۔ چونکہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایران فتح کیا اس لیے ایرانیوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے دشمنی اور دشنام کو اپنا قومی شعار بنالیا اور ہنوز یہی جذبات کارفرما ہیں۔ چنانچہ ایک ایرانی شاعر فردوسیؔ نے اپنے معاندانہ جذبات کا اظہار ایرانی قوم کی زبان سے یوں کیا ہے: ؎

ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید ست کار

کہ تختِ کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو!

[اونٹنی کا دودھ پینے اور گوہ کا گوشت کھانے کی جگہ اب عربوں کو یہ کام ملا کہ وہ عظیم المرتبت شاہانِ ایران کے تخت و تاج کی آرزو کرنے لگے۔ تف ہے تم پر اے بدلتے ہوئے آسمان تف ہے تم پر!]

سچ کہا ہے کسی نے ع

با آلِ عمرؓ کینہ قدیم است عجم را!

[آلِ عمرؓ سے ایرانیوں کا بغض بہت پرانا ہے]

قصہ مختصر، مسلمان عجم میں آکر فلسفیانہ مسائل میں ایسے منہمک ہوئے اور پھر ایسے اُلجھے کہ ابھی تک نجات نہیں پا سکے اور میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ صورِ اسرافیل تک الجھے رہیں گے۔ کیونکہ کہاں مباحثے اور مجادلے کی لذت و راحت اور کہاں میدانِ جنگ کی صعوبت وکلفت۔

یاد رکھو! منطق اور فلسفہ اور کلام میں انہماک کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ قوم جہاد اور قتال سے بیگانہ محض ہو جاتی ہے۔ اس کا ثبوت درکار ہو تو تاریخِ ہند کا مطالعہ کافی ہوگا۔ صرف ایک مثال درج کیے دیتا ہوں۔ جب گیارہویں صدی عیسوی (پانچویں صدی ہجری) میں محمود غزنوی نے ہندوستان کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندنا شروع کیا تو یہ زمانہ ہندوستان میں منطق، فلسفہ اور کلام کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس موقع پر اگر مَیں اس عروج کی تفصیل بیان کرنے لگوں تو اپنے موضوع سے بالکل منقطع ہو جاؤں گا، اس لیے اس وقت صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اُس زمانے میں ہندوستان جنّت نشان میں صرف فلسفے کے چالیس مختلف النوع مدارسِ فکر (بیس سے زائد صرف ہندومت میں اور اٹھارہ بدھ مت، جین مت اور چارواک میں) موجود تھے جو رات دن مناظروں اور مباحثوں میں مشغول رہتے تھے۔ نتیجہ اس اشتغال بالفلسفہ والمنطق کا یہ نکلا کہ پوری قوم جنگی اسپرٹ سے بیگانہ ہوگئی تھی۔ منطق اور فلسفے نے ہندوؤں کے قوائے عملیہ کو ضعیف کر دیا تھا اور وہ کسی جنگ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ جس طرح چوتھی صدی ہجری میں بغداد کے مسلمانوں نے اسماعیلیوں کو تین لاکھ اشرفیاں پیش کی تھیں کہ حجرِ اسود واپس کر دو، اسی طرح پانچویں صدی میں سومنات کے ہندوؤں نے محمود کو دس لاکھ اشرفیاں پیش کی تھیں کہ بُت

کو مت توڑو۔ محمود نے کہا "مَیں بُت فروش بننے کے بجائے بت شکن بننا پسند کرتا ہوں، مَیں نہیں چاہتا کہ تاریخ میں میرا نام محمود بُت فروش درج کیا جائے۔"

گویا یہود کی طرح ایران نے بھی انتقام لے لیا، یعنی مسلمانوں کو رفتہ رفتہ قرآن سے بُعد ہوتا چلا گیا اور نتیجتاً جہاد کا تصوّر دماغ سے محو ہوتا چلا گیا۔ جہاد بالسیف سے بیگانگی کا نتیجہ ۱۲۵۸ء میں ظہور پذیر ہوا جب ہلاکو نے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے مشہور سبائی مشیرِ خاص نصیرالدین طوسی کے مشورے اور رسوائے زمانہ سبائی وزیر اعظم ابنِ علقمی کے ایماء سے بغداد کو فتح کر کے دریائے دجلہ کو پندرہ لاکھ منطقی، فلسفی، متکلم، شاعر، موسیقار، منجم و مہندس مسلمانانِ بغداد کے خونِ بے حمیت و بے غیرت سے سرخ کر دیا۔ اور سعدی شیرازی نے اپنی آنکھوں سے خونباری کے بعد آسمان کے لیے بھی جواز پیدا کر دیا۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المومنین!

[اگر آسمان امیر المومنین مستعصم باللہ کی بادشاہت کے زوال پر خون برسائے تو یہ اُس کے لیے روا ہے۔]

اگر مسلمان جہاد کی لذّت سے بیگانہ نہ ہو گئے ہوتے تو ایک نہیں دس ہلاکو بھی بغداد کو فتح نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب سلاطینِ عباسی کے محلوں میں جارجیہ اور سرکاشیہ کی حسین ترین لڑکیاں ہزاروں کی تعداد میں جمع تھیں تو ایسے عالَم ہوش ربا میں جہاد کا خیال کس کافر کے دماغ میں آ سکتا تھا؟

فٹن نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب
یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر! یہ خوب کہی! (اکبر)

ایرانیوں نے کمال چابکدستی سے اسلام کے ظاہری ڈھانچے کو تو قائم رکھا مگر اس میں سے روح نکال دی۔ یعنی مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ کر دیا اور قرآنی تعلیم کی جگہ اسلام کا ایک نیا ایڈیشن مرتّب کر دیا، جس میں سب کچھ تھا مگر جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر نہ تھا۔ سچ کہا اکبر نے ؎

بہت ہی کم پائے اپنے عارف، کلامِ باری نے ہم میں آکر
سرے سے بگڑا ہے سچ جو پوچھو عرب کا مذہب عجم میں آکر

(۳) تصوّف میں غیر اسلامی عقائد کی آمیزش

قرآن سے بُعد و بیگانگی کی تیسری وجہ یہ ہوئی کہ ایران میں آ کر جس طرح اسلام میں شرک اور شخصیت پرستی کے ناپاک عناصر داخل ہو گئے اسی طرح تصوّف میں غیر اسلامی عقائد داخل ہو گئے اور وہ تصوّف جو عبارت تھا جہاد و مجاہدہ سے وہ بالکل ''ترکِ دنیا' ترکِ عقبیٰ' ترکِ مولیٰ' ترکِ تُرک'' یعنی سراسر Renunciation اور رہبانیت بن گیا اور مساجد ویران اور خانقاہیں معمور ہوتی چلی گئیں۔ اور یہ ایرانیوں نے انتقام کی تیسری شکل اختیار کی کہ مجاہدوں کو گوشہ نشین بنا دیا۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند
گریبانِ شہنشاہاں دریدند!
چو آں آتش درونِ سینہ افسرد
مسلماناں بدرگاہاں خزیدند!

[فقیروں نے جب تک مسجدوں میں صف بندی کی انہوں نے بادشاہوں کے گریبان چاک کر دیے۔ (لیکن) جب وہ آگ سینوں میں بجھ گئی تو مسلمان شاہی درباروں میں گھس گئے۔]

چنانچہ قرآن سے بے تعلقی کا ایک اہم سبب یہ خانقاہیں بن گئیں۔ دراصل ان کا واضح اور معین مقصد تو یہ نہیں تھا کہ مسلمان قرآن سے بیگانہ ہو جائیں مگر شام' عراق' ایران' ترکستان اور ہندوستان ان سب ممالک میں حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ ان خانقاہوں کی چار دیواری سے قرآن آہستہ آہستہ خارج ہوتا چلا گیا۔

جو خدا کا نام لے سکتے تھے وہ رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!

(بہ تبدیلی الفاظ)

بے شک سلطان الہند نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے خلیفہ حضرت چراغِ دہلیؒ کی خانقاہوں میں قال اللہ تعالیٰ اور قال الرسول ﷺ کی آوازیں بھی بلند ہوتی تھیں مگر پندرہویں صدی سے قرآن ان خانقاہوں سے یعنی صوفیوں کے نصابِ تعلیم سے خارج ہو گیا اور صوفیوں کا مقصد حیات صرف ذکر اور مراقبہ بن گیا۔

یہاں ایک اہم نکتے کی وضاحت کر دوں' میرے اس قول سے کہ ''صوفیوں کا مقصدِ حیات صرف ذکر و مراقبہ تھا'' کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مَیں ذکر و مراقبے کی افادیت اور اہمیت کا منکر ہوں۔ یہاں جو بات مَیں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ عموماً صوفیاء ساری عمر ذکر اور مراقبے میں بسر کر دیتے ہیں' حالانکہ ذکر و مراقبہ مقصود بالذّات ہرگز نہیں ہے بلکہ مقصود بالعرض ہے۔ یہ اس لیے کرایا جاتا ہے کہ سالک کے نفس کا تزکیہ ہو جائے اور وہ سلطانِ جائر کے سامنے کلمۂ حق کہہ سکے۔ لیکن ایک عرصۂ دراز سے ذکر اور مراقبہ ہی مقصود بالذات بن چکا ہے۔ اب کوئی کلمۂ حق کہنے والا' ان خانقاہوں سے (جو پاکستان میں شاد اور آباد ہیں) میدان میں نہیں آتا۔ اسی لیے تو اقبال نے کہا ؎

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

اس شعر میں تلمیح ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی طرف کہ ساقی کا فیض غیر مشروط نہیں ہے' وہ راستہ ضرور دکھاتے ہیں مگر انہی کو جو اُن کے لیے مجاہدہ کریں۔ افرنگی صوفوں پر بیٹھنے والے فیض یاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ یہ قانونِ الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ﴾ (العنکبوت: ۶۹)

''اور جنہوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم سمجھا دیں گے ان کو اپنی راہیں۔''

چنانچہ خود اقبال ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ؎

ایں چنیں دل خود نگر' اللہ مست
جز بدرویشی نہ مے آید بدست!

[اس طرح کا اپنی ذات میں جھانکنے والا اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول دل درویشی کے بغیر ہاتھ آنا ممکن نہیں!]

(۴) اشتغال بالحدیث

قرآن سے بے تعلقی کی چوتھی وجہ اشتغال بالحدیث ثابت ہوا اور اس میں غیر معمولی انہماک کی وجہ یہ ہوئی کہ سبائیوں' زندیقوں' منافقوں اور ایرانیوں نے محض انتقام لینے کے جذبے سے سرشار ہو کر لاکھوں جھوٹی حدیثیں وضع کر کے مسلمانوں میں شائع بھی کر دیں اور کتابوں میں درج بھی کر دیں اور منافقانہ طور پر مسلمان بن کر اسلامی مدارس میں ان احادیث کا درس بھی دیا اور انہیں سادہ لوح مسلمانوں کے ذہنوں میں اس طرح پیوست کر دیا کہ وہ ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود ہنوز جزوِ ایمان وعقائد بنی ہوئی ہیں۔ اگر ان کی مثالیں دوں تو پھر اپنے موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ سامعین بطور خود ''موضوعاتِ کبیر'' مصنفہ مُلّا علی قاریؒ کا مطالعہ کریں۔ پانچ سو جھوٹی حدیثیں تو مجھے بھی معلوم ہیں۔ اسی لیے ایک ایک روایت کی تحقیق کے لیے مسلمانوں کو ہزاروں میل کا سفر طے کرنا پڑا اور جب امام اسمٰعیل بخاریؒ نے مشہورِ عالم مجموعۂ احادیث مرتّب اور مدوّن کیا تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف تین ہزار قبول کیں۔

مَیں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حدیثوں کی چھان پھٹک میں مسلمان اس قدر منہمک ہو گئے کہ قرآن کی طرف وہ توجّہ مبذول نہ کر سکے جس کا وہ مستحق تھا اور وہ پس منظر میں چلا گیا۔

(۵) اشتغال بالفقہ

قرآن سے بُعد وبیگانگی کی پانچویں وجہ یہ ہوئی کہ حکومت میں عہدہ حاصل کرنے یا مجسٹریٹ اور جج بننے کے لیے صرف فقہ کی ضرورت تھی۔ اس لیے مسلمانوں کی توجّہ قدرتی طور پر تحصیلِ فقہ کی طرف مبذول ہوگئی اور قرآن بیک گراؤنڈ میں چلا گیا۔ اس لیے کہ جب صرف فقہ پڑھ کر عزّت اور حکومت مل سکتی ہے تو کوئی قرآن کیوں پڑھے؟

(۶) ملوکیت کا اثر

قرآن سے بیگانگی کی چھٹی وجہ یہ ہوئی کہ جب مسلمانوں میں ملوکیت مستحکم ہوگئی تو ملوک اور سلاطین نے علماء کو مشورے کے رنگ میں حکم دیا یا حکم کے رنگ میں مشورہ دیا کہ مسلمانوں کی توجّہ حدیث اور فقہ پر مبذول کر دو۔ اپنے حلقہ درس میں قرآن کی تعلیم عام مت کرو کیونکہ اس کی زد بہرحال ملوکیت پر پڑے گی۔

زیر گردوں آمری از قاہری است
آمری از ماسوی اللہ کافری است!

[آسمان کے نیچے (زمین پر) آمریت ظلم وقہر سے ہے۔ جو آمریت اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت پر مبنی ہو وہ کافری ہے۔]

اور ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

ظاہر ہے کہ ہارون اور مامون سے لے کر شاہجہان اور عالمگیر تک سب کی نفی ہو جائے گی اور یہ لوگ بقول اقبال بُت بن جائیں گے۔ مسلمان حکمرانوں کو نہ اس کی ضرورت تھی نہ وہ یہ چاہتے تھے کہ عوام قرآنی تعلیمات سے آگاہ ہو کر کوئی انقلاب برپا کریں اور اس طرح ان کے عیش میں خلل پڑے۔ رہے علماء اور صوفیاء تو وہ خود قرآن سے بے تعلق تھے یا غیر جانبدار کہہ لو۔ نہ اقراری کنم ونہ انکاری کنم۔ علماء کا مبلغ علم فقہ تھا اور صوفیاء کا منتہائے پرواز بلکہ مقصدِ حیات ذکر ومراقبہ' تو وہ قرآن کا ترجمہ کیوں کرتے؟ تو جب سلاطین' نوابوں' جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا فائدہ اس میں تھا کہ عوام قرآن سے بیگانہ رہیں تو علماء اور صوفیاء پاگل تھے جو سلاطین سے ٹکر لیتے؟ اور اپنے وظیفے بند اور جاگیریں ضبط کراتے؟ نہ ہر عالمِ دین امام ابن تیمیہؒ ہو سکتا ہے اور نہ ہر صوفیٔ صافی امامِ ربّانی مجدد الف ثانیؒ ہو سکتا ہے ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار!

(۷) درسِ نظامی میں قرآن سے اعراض

قرآن سے مسلمانوں کی بیگانگی کی ساتویں وجہ یہ ہوئی کہ جب اورنگزیب کے عہد میں مُلّا نظام الدین سہالوی نے مشہورِ عالم درسِ نظامیہ مدوّن کیا (جو گزشتہ تین سو سال سے بجنسہٖ و بعینہٖ ہمارے عربی مدارس پر حکمران ہے) تو اس میں منطق کی تو پندرہ [1] کتابیں رکھیں لیکن

(۱) صُغریٰ۔ کُبریٰ۔ قال اقول۔ میزان المنطق۔ بدیع المیزان۔ تہذیب۔ شرح تہذیب۔ مرقاۃ قطبی۔ میر قطبی۔ سُلّم العلوم۔ مُلّا حسن۔ مُلّا مبین۔ قاضی مبارک۔ حمد اللہ (اور میرے بچپن میں غلام یحییٰ بھی داخلِ درس تھا۔)

قرآن کے صرف ڈھائی پارے اور وہ بھی بطورِ تبرک۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عربی مدارس کے طلبہ کے دماغوں میں‘ جو آگے چل کر علماء بنتے ہیں‘ قرآن کی کوئی اہمیت سرے سے جاگزیں نہیں ہو پاتی اور وہ قرآن سے متعلق کسی موضوع پر نہ تقریر کر سکتے ہیں اور نہ چار سطریں لکھ سکتے ہیں‘ اِلّا ماشاء اللہ!

نوٹ: تقلید کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے علماء جو آج ۱۹۷۶ء میں مصروفِ درس و تدریس ہیں‘ وہ اتنی جرأت نہیں رکھتے کہ اس نصاب میں جو ۱۶۸۶ء میں مدوّن ہوا تھا‘ کوئی تبدیلی کر سکیں۔ اسی لیے عام طور پر نئے فاضلینِ درسِ نظامی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تبوک مدینہ سے کتنے میل دور ہے؟ اور ہے کہاں؟ جنگِ یرموک کب واقع ہوئی تھی؟ قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کس سن میں ہوا تھا؟ وَقِس علیٰ ھذا!

(۸) عربی زبان سے عدم توجّہی

قرآن سے بیگانگی کی آٹھویں وجہ یہ ہے کہ نہ صرف ایران بلکہ عالَمِ اسلام کے تمام مشرقی ممالک میں دفتری زبان فارسی ہوگئی اور عربی کی حیثیت صرف ثانوی رہ گئی۔ چنانچہ جب صرف ''کنز'' اور ''قدوری'' پڑھ کر ایک مسلمان کو سرکاری عہدہ مل سکتا تھا تو وہ قرآن پر عرق ریزی کیوں کرتا!

(۹) جاگیرداری کا اثر و رسوخ

قرآن سے دُوری کی نویں وجہ یہ ہے کہ سرمایہ داروں‘ نوابوں اور جاگیرداروں کو قرآن میں اپنی موت نظر آئی۔ چنانچہ علّامہ اقبال فرماتے ہیں:

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ!
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو!
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
رأیتِ حق از ملوک آمد نگوں
قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

نفسِ قرآں تا دریں عالم نشست
نفس ہائے کاہن و پاپا شکست
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ
آنچہ از حاجت فزوں داری بدہ!

[(جانتے ہو) قرآن کی حقیقت کیا ہے؟ سرمایہ دار کے لیے موت کا پیغام اور بے سروسامان لوگوں کا سہارا و آسرا!
دولت سمیٹنے والے سے کسی بھلائی کی توقع نہ کرو۔ (اس لیے کہ قرآن نے صاف فرما دیا ہے کہ) ''تم نیکی کا مقام ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ (بجائے سمیٹنے اور جمع کرنے کے) خرچ کرنے کی عادت نہ ڈالو!''
حق کا پرچم بادشاہوں کے باعث نیچا ہو جاتا ہے اور ان کی وجہ سے بستیاں کی بستیاں خوار و بدحال ہو جاتی ہیں۔
جب اس دنیا میں قرآنی تعلیمات کا سکہ چلا تو کہانت اور پاپائیت ایسے گمراہ کن سلسلوں کا زور ٹوٹ گیا۔
مسلمانوں سے کہو کہ جان ہتھیلی پر رکھ لیں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لیے کمر کس لیں) اور جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ سب (اللہ کی راہ میں) دے ڈالیں!]

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است و مفت
دِہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطنِ ''الارضُ لِلّٰہ'' ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است!

[اللہ تعالیٰ نے زمین کو صرف ہماری متاع فرمایا ہے (ملکیت نہیں) اور یہ بے بہا متاع مفت ہے مفت!
اے جاگیردار! مجھ سے یہ نکتہ سمجھ۔ زمین سے رزق اور قبر حاصل کر‘ اس پر قبضہ نہ کر!
''زمین اللہ تعالیٰ کی ہے'' اس کے معنی ظاہر ہیں۔ جو اس ظاہر کو نہیں دیکھتا وہ کافر ہے!]

تو ان لوگوں نے کوشش کی کہ قرآن کی تعلیم عام نہ ہونے پائے اور یہ لوگ اپنے اثر ورسوخ اور مال وزر کی بنا پر اپنے مقصد مشئوم میں کامیاب ہو گئے اور مسلمان قرآن سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

(۱۰) حکومت اور دولت کا حصول

قرآن سے بیگانگی کی دسویں اور آخری وجہ یہ ہوئی کہ جب عوام اور خواص' حکومت اور اس کے نتیجے میں دولت سے مستفید ہوئے تو وہ تمام عیوب ان میں پیدا ہو گئے جو حکومت اور دولت کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ عیوب مثلاً عقیدے کی خرابی بلکہ خرابیاں' غیر اسلامی رسوم پر عمل اور انہیں داخلِ اسلام سمجھنا اور خلافِ قرآن زندگی بسر کرنا' یہ چیزیں اس قدر محبوب ہو گئیں کہ مسلمانوں کا مذہب بن گئیں (تفصیل میں مصلحتاً جانا نہیں چاہتا' کیونکہ تفصیل میں بعض عناصر کی نشاندہی کرنی پڑے گی اور یہ بات خلافِ مصلحت ہے) ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست!

[مصلحت نہیں ہے کہ اس راز کو فاش کیا جائے' ورنہ ایسی کوئی خبر نہیں ہے جس کا ذکر مے کشوں کی محفل میں نہ ہو!]

اب قرآن تو ان سب باتوں کا دشمن ہے' مثلاً قرآن کہتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ⑬ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ﴾ (فاطر: ۱۴)

''اور جن کو تم پکارتے ہو اُس کے سوا' وہ مالک نہیں کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے بھی۔ اگر تم ان کو پکارو سنیں نہیں تمہاری پکار' اور سنیں تو پہنچ نہ سکیں تمہارے کام پر' اور قیامت کے دن منکر ہوں گے تمہارے شریک ٹھہرانے سے۔''

''قِطمیر'' وہ سفیدی ہے جو کھجور کی گٹھلی کے سرے پر پائی جاتی ہے اور اس سے کم تر اور بے قیمت چیز عربوں کے یہاں موجود نہیں تھی۔

یہ صرف ایک آیت ہے' قرآن میں اسی مضمون کی سینکڑوں آیات ہیں۔ تو ان طبقات نے جو سلاطین' اُمراء' علماءِ سُوء اور صوفیاءِ سُوء پر مشتمل تھا ایسی کوشش کی کہ عوام اور خواص دونوں قرآن سے بیگانہ ہو جائیں' تاکہ ہماری غیر قرآنی زندگی اور عقائد و رسوم اور طرزِ حیات پر گرفت نہ

کر سکیں' بلکہ شرک اور اولیاء پرستی اور قبور پرستی اور آثار پرستی' سب کو عین اسلام سمجھیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب عوام اور خواص قرآن سے بیگانہ ہو جائیں۔ چنانچہ چاروں طبقات کی ملی بھگت سے مسلمان قرآن سے بیگانہ ہو گئے۔ (بقول عبداللہ بن مبارکؒ) ؎

وَهَلْ اَفْسَدَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ
وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَ رُهْبَانُهَا!

[دین میں بگاڑ پیدا کرنے والے کوئی اور نہیں' یہی تین طبقات تھے: بادشاہ' علماءِ سُوء اور صوفیاء]

اور یہ بھی غالباً اسی ملی بھگت کا نتیجہ تھا کہ پورے ایک ہزار برس تک قرآن حکیم کا مسلمان اقوام کی مادری زبانوں میں ترجمہ کرنے کی مخالفت کی گئی۔ واللہ اعلم!

جب ۱۲۰۶ء میں مسلمانوں کی حکومت ہند میں قائم ہوئی تو مسلمان جو اسلام اپنے ساتھ لائے اس کا منبع و مبنیٰ قرآن نہیں تھا بلکہ صرف علم فقہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ سلاطینِ دہلی یا علماءِ ہند نے قرآن کا ہندوستان کی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ کام اللہ کے ایک برگزیدہ بندے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۷۴۰ء کے قریب انجام دیا۔ یعنی مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے پانچ سو سال بعد شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ شائع ہوا' کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ مسلمان قرآن سے بالکل بیگانہ ہو چکے تھے۔

یہ کہے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ انگریزوں کی حکومت باضابطہ طور پر ۱۷۷۲ء میں قائم ہوئی اور حکومت نے اپنی نگرانی میں ۱۷۹۲ء میں پوری بائبل کا ترجمہ بنگلہ زبان میں شائع کر دیا اور اس کے بعد ۱۸۰۶ء میں بائبل کا ترجمہ فارسی زبان میں شائع ہو گیا۔ یہ تراجم حکومت کی سرپرستی میں شائع ہوئے۔ ۱۸۴۰ء میں مرزا پور سے بائبل کا ترجمہ اردو میں شائع ہوا اور اس کے بعد ہندی میں۔

ہندوستان میں اٹھارہ زبانیں ہیں اور دو سو بولیاں۔ آج بائبل کا ترجمہ ان ساری زبانوں میں موجود ہے اور سامعین کی معلومات کے لیے یہ بھی بیان کیے دیتا ہوں کہ بائبل کا ترجمہ دنیا کی سات سو پینسٹھ (۷۶۵) زبانوں میں ہو چکا ہے اور طالبین کو برائے نام قیمت پر مل سکتا ہے۔ دوسری طرف ہم ہیں کہ ہم نے چھ سو برس حکومت کی' اور ہندوستان کی چھ زبانوں میں

بھی قرآن کا ترجمہ نہیں کیا۔ ہندوستان میں ہندی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ۱۹۲۶ء میں خواجہ حسن نظامیؒ نے شائع کیا تھا۔

علماء کی تنگ نظری ملاحظہ ہو! فارسی میں ترجمہ کرنے کے ’’جرمِ عظیم‘‘ میں مولویوں نے بعض لوگوں کو شاہ صاحب (ولی اللہؒ) کے قتل پر آمادہ کیا۔ لیکن دشمنانِ دین اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۸۰۵ء میں یعنی قیامِ حکومت کے چھ سو سال بعد شاہ ولی اللہؒ کے فرزند شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حکومت کا چراغ‘ جو ۱۸۰۳ء سے ٹمٹما رہا تھا‘ گل ہو گیا۔ ’’مسلماناں در گور و مسلمانی در کتاب‘‘۔ انگریزی حکومت کے زیر اثر مسلمان عوام قرآن تو کجا اسلام ہی سے بیگانہ ہو گئے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

بیسویں صدی میں سب سے پہلے اکبر نے مسلمانوں کو قرآن کی طرف بلایا ؎

مغوی تو ملیں گے تمہیں شیطان سے بہتر
ہادی نہ ملے گا کوئی قرآن سے بڑھ کر!

ان کے بعد اقبال نے مسلمانوں سے کہا ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن!

[اب اگر تو (دوبارہ) مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے تو (اچھی طرح جان لے کہ) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیاتِ نو کی بنیاد قرآن پر قائم کرے!]

لیکن مسلمان من حیث القوم ہنوز قرآن سے بیگانہ ہیں۔ ان کی زندگی میں سب کچھ داخل ہے مگر قرآن داخل نہیں ہے۔ جبھی تو اقبال نے کہا ؎

بہ بندِ صوفی و مُلّا اسیری
حیات از حکمت قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین او آساں بمیری!

[تُو صوفی و مُلّا کی زنجیروں میں قید ہے اور قرآن کی حکمت سے زندگی حاصل نہیں کرتا۔ (افسوس کہ اے مسلمان!) تجھے اس کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کر لے!]

حرفِ آخر

فی الجملہ یہ بات میرے لیے باعثِ صد مسرت ہے کہ میرے عزیز بھائی ڈاکٹر اسرار احمد سلّمہ نے مسلمانوں کو قرآن حکیم سے روشناس کرنے کے لیے ایک منظّم تحریک کا آغاز کر دیا ہے تاکہ مسلمانانِ پاکستان اپنے اندر وہ باطنی انقلاب پیدا کر سکیں جس کے نتیجے میں وہ خارج میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ مَیں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر ملّت کی اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں کو قرآن کی طرف بلایا جائے اور ان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ:

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟
زیرِ گردوں سِرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ‘ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم!
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

[کیا تُو جانتا ہے کہ تیرا آئین کیا ہے؟ اس آسمان کے نیچے تیرے وقار کا راز کیا ہے؟ وہ زندہ کتاب‘ قرآن حکیم‘ جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی! زندگی کے وجود میں آنے کے رازوں کا خزینہ۔ جس کی حیات افروز قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔]

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویاست ایں!

[(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!
(یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے۔
یہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اُسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی۔
اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!]

واضح ہو کہ تعمیرِ فکر کے لیے سب سے پہلے تطہیرِ فکر لازمی ہے اور تطہیرِ فکر قرآن حکیم میں تدبّر کے بغیر محالِ عادی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ برادر عزیز القدر کو اپنے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آخر میں سامعین کے لیے اقبال کا ایک شعر بطور ارمغاں پیش کرتا ہوں ؎

بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ اَم آبِ حیات

[(اے مسلمان!) اگر دوام وثبات اور قوت واستحکام کا طالب ہے تو قرآن کے سامنے دستِ سوال دراز کر۔ اس لیے کہ مجھے قرآن ہی کے مخفی چشموں میں آبِ حیات کا سراغ ملا ہے!]

❁❁❁

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص **160** روپے، اشاعت عام **80** روپے

عمر رسیدہ مسلمان

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

زندگی یعنی مہلتِ عمر انمول نعمت ہے‘ اس کا کوئی متبادل نہیں۔ یہ مہلت ہر شخص کے لیے مختلف ہے اور کسی کو نہیں پتا کہ یہ کب ختم ہو جائے گی۔ البتہ ہر ایک کو اس بات کا یقین ہے کہ یہ دُنیوی زندگی ایک دن ختم ہو جائے گی۔ قرآن حکیم میں تین مرتبہ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ ’’ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے۔‘‘

اگرچہ ہر شخص روز بروز اپنی مہلتِ عمر ختم کر رہا ہے‘ لیکن پھر بھی بچہ ہو یا جوان اپنی سالگرہ پر خوش ہو رہا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خوشی نہیں بلکہ فکرمندی کا لمحہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مہلتِ عمر کے جتنے سال متعین کر رکھے ہیں ان میں سے ایک سال کم ہو گیا ہے۔ دانا تو کہتے ہیں کہ وقت کا یہ نقصان دہرا ہوتا ہے۔ ایک طرف انسان اپنی عمر بڑھا کر آخری لمحے کی طرف رواں دواں ہے تو دوسری جانب اس کی زندگی کا آخری لمحہ تیزی کے ساتھ قریب تر ہوتا جا رہا ہوتا ہے۔ بقول شاعر ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی!

جوانی میں انسان کے اعضاء و جوارح مضبوط اور صلاحیتیں زوروں پر ہوتی ہیں۔ اس کی خواہشات اور مستقبل کے منصوبے اسے موت کی گھڑی سے بے اعتنا رکھتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ یکے بعد دیگرے عدم کو روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ مرنے والوں کا جنازہ پڑھتا‘ کفن دفن کرتا اور انہیں بے یار و مددگار قبر کے تاریک گڑھے میں اُتار کر سینکڑوں من مٹّی کے نیچے دبا دیتا ہے۔ اس کے باوجود یہ منظر اُسے متاثر نہیں کرتا کہ اس کے رویے میں کسی قسم کی تبدیلی آئے‘ اور وہ یہ یاد کرے کہ وہ وقت بھی دن بدن قریب آ رہا ہے جب اسے بھی اس انجام سے دوچار ہونا اور اپنے

عزیز رشتہ دار اور دوست احباب کو چھوڑ کر انتہائی بے بسی کے عالَم میں اس دنیا سے کوچ کرنا ہے۔ کسی کی تدفین کے وقت یا جنازہ پڑھتے وقت اپنی موت کا خیال آتا بھی ہے تو صرف ایک لمحے کے لیے۔ حالانکہ کسی صاحب دانش و حکمت نے کیا خوب کہا ہے: كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا (وعظ و نصیحت کے لیے تو موت ہی کافی ہے!)

اللہ تعالیٰ نے بڑی حکمت کے تحت ہر شخص کی موت کا وقت اس سے خفیہ رکھا ہے‘ اگرچہ مقرر کر رکھا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ انسان زندگی کے ماہ و سال کے منصوبے بناتا اور ان کو انجام دینے کے لیے محنت کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی عمریں بتا دیتا تو زندگی کا کاروبار ایک لمحہ بھی نہ چل سکتا‘ کیونکہ انسان ہر وقت اسی سوچ میں گم رہتا کہ اس کا آخری وقت قریب آ رہا ہے۔ وہ موت کے لیے قبل از وقت ہی فارغ ہو کر بیٹھ جاتا اور کوئی منصوبہ نہ بناتا کہ اسے تو فلاں وقت دنیا چھوڑ جانا ہے‘ لہٰذا اس لمبے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

جوانی گزر جاتی ہے اور بڑھاپے کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ انسان پر عیاں ہو جاتا ہے کہ مہلتِ عمر اب زیادہ باقی نہیں رہی۔ جو وقت گزر گیا‘ سو گزر گیا۔ اس پر پچھتانا تو کوئی فائدہ نہ دے گا‘ البتہ اپنی گزشتہ زندگی کی کوتاہیوں کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا‘ بُری عادات اور بُرے کاموں سے توبہ کرنا اُس کا معمول ہو جانا چاہیے۔ گزری ہوئی زندگی کی نالائقیوں کو یاد کر کے افسردہ ہونا گناہوں کو مٹا دیتا ہے‘ اگر یہ پچھتاوا خلوص کے ساتھ ہو۔ کسی نے نوجوانی کے عالَم میں اپنے والدین کی خدمت کر کے انہیں خوش نہیں کیا بلکہ نافرمانیوں کے باعث انہیں رنجیدہ رکھا‘ حتیٰ کہ اس کے ماں باپ فوت ہو گئے۔ یہ شخص اب ہوش میں آیا اور پچھتایا کہ مَیں نے ماں باپ کو کیوں رنجیدہ کیا۔ اب وہ شخص اپنی زندگی کے باقی ایام میں اپنے ماں باپ کی مغفرت کے لیے دعاگو رہتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس کے اس پُرخلوص جذبے اور والدین کے حق میں مغفرت کی دعا اس کو نافرمان کی بجائے فرماں بردار لکھوا دے گی۔

عمر رسیدہ لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ پچھلی زندگی کے گناہوں اور کوتاہیوں کو یاد کر کے افسوس کریں‘ پچھتائیں اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں۔ جن جن کاموں کی تلافی ہو سکتی ہو‘ اُس کے لیے جِدّ و جُہد کریں۔ جن لوگوں کے ساتھ انہوں نے زیادتی کی ہو وہ اگر زندہ

ہوں تو اُن سے معافی چاہیں‘ اور جس طرح کا بھی نقصان کیا ہو اس کو پورا کریں۔ اگر وہ شخص فوت ہو چکا ہو تو بھی اس کے نقصان کا ممکن طریقے سے ازالہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی چاہیں۔ اللہ تعالیٰ کو وہ بوڑھا سخت ناپسند ہے جو بڑھاپے میں بھی بدکار اور بدعمل ہو۔ ہمیں ایسے لوگوں پر ترس آنا چاہیے جو اپنے انجام کو پہنچنے والے ہیں مگر نتائج سے بے خبر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ سے ایک صاحب نے دریافت کیا: یارسول اللہ! سب سے اچھا انسان کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَحَسُنَ عَمَلُهُ)) ’’جس کو لمبی عمر ملی اور اس نے عمل بھی اچھے کیے‘‘۔ اُن صاحب نے پھر دریافت کیا: تو سب سے بُرا انسان کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَسَاءَ عَمَلُهُ)) ’’جس کو عمر تو لمبی ملی مگر اُس نے برائیوں میں گزار دی۔‘‘ (سنن الترمذی)

قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۴۸) ’’نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ!‘‘ یہ حکم سب کے لیے ہے‘ مگر عمر رسیدہ لوگ تو زندگی کے بقیہ وقت کو غنیمت جانیں اور ہر طرح کی برائیاں چھوڑ کر نیکیوں کی طرف لپکیں۔ ناراض رشتہ داروں کو راضی کریں‘ معافی کا رویّہ اپنائیں‘ انتقام لینے کا ارادہ بالکل ترک کر دیں۔ جو اللہ کے بندوں کو معاف کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اُسے معاف کرتا ہے اور جو لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے اللہ بھی اس کے ساتھ سختی کا سلوک کرتا ہے۔

عمر کی زیادتی کے ساتھ انسان میں مال و دولت کی چاہت بھی روز افزوں ہوتی ہے‘ اس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ بوڑھا آدمی جو مال چھوڑ جائے گا وہ تو اُس کے وارثوں کا ہو جائے گا۔ اگر وہ اس کو نیکی کے کام میں لگائیں گے تو ثواب وارثوں ہی کو ہوگا۔ جس بوڑھے نے محنت کے ساتھ وہ مال جمع کیا تھا‘ اس کے ہاتھ تو کچھ نہ آیا‘ اس لیے کہ وفات کے ساتھ ہی اُس کا جمع کیا ہوا مال اُس کی ملکیت سے نکل گیا۔ وہ اگر اپنے ہاتھوں اسے نیک کاموں میں خرچ کرتا تو ثواب کماتا۔

عمر رسیدہ لوگ اپنی استطاعت کے مطابق کثرت سے نوافل پڑھیں تاکہ ان کی فرض نمازوں میں جو کمی کوتاہی رہ گئی ہو‘ اللہ تعالیٰ مہربانی سے اُسے دور کر دے۔ وہ عمر رسیدہ بوڑھا جو ابھی تک بے نماز رہا‘ اُس جیسا بدنصیب کوئی نہ ہوگا۔ اسی طرح وہ بھی جو مال کی محبّت میں غرق ہو کر زکوٰۃ ادا نہ کرتا ہو۔ نماز اور زکوٰۃ دینِ اسلام کے رکن ہیں۔ ان کی ادائیگی کے بغیر کوئی

مسلمانی کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے؟

عمر رسیدہ لوگوں کو احساس ہونا چاہیے کہ لمبی عمر دے کر اللہ تعالیٰ نے انہیں گزشتہ گناہوں کی بخشش مانگنے اور بیش از بیش نیکی کے کام کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس موقع سے کما حقّہٗ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مہلتِ عمر ختم ہو گئی تو اُس وقت کا پچھتاوا کسی کام نہ آئے گا۔ یہ جہان دارالعمل ہے۔ جب انسان اپنی مہلتِ عمر ختم کر کے دارالجزاء میں داخل ہو گیا تو اُس کے عمل کا موقع ختم ہو گیا۔ ایک بندہ پنج گانہ نماز ادا کرتا ہے۔ اگر وہ ظہر کی نماز ادا کر چکا اور فوت ہو گیا تو اب وہ عصر کی نماز نہ پڑھ سکے گا اور نہ ہی اس کا اجر پائے گا۔ اسی طرح فوت ہونے والا کوئی ورد وظائف اور نیکی کے دوسرے کام بھی نہیں کر سکے گا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ دارالعمل میں اس کی مہلت ختم ہو چکی ہے۔ جس طرح کمرۂ امتحان میں بیٹھا ہوا طالب علم وقت ختم ہونے پر پرچہ نگران کے حوالے کر دیتا ہے‘ اور بس۔ اب وہ ایک لفظ بھی لکھنا چاہے گا تو اس کو لکھنے نہ دیا جائے گا۔

ایک بزرگ فوت ہو گئے۔ ایک شخص کو ان کی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے ان سے محبّت تھی۔ اسے خواب میں وہ بزرگ ملے۔ اُس شخص نے انہیں سلام کیا مگر انہوں نے جواب نہ دیا۔ اُس نے پھر سلام کیا مگر جواب نہ پایا۔ اس پر اُس نے پوچھا: ’’حضرت! مَیں سلام کرتا ہوں‘ آپ جواب نہیں دیتے؟‘‘ وہ بزرگ کہنے لگے: ’’فوت شدہ آدمی دارالعمل سے چلا آتا ہے‘ اب وہ کوئی نیکی نہیں کر سکتا۔ سلام کا جواب دینا نیکی ہے‘ لہٰذا میں اب سلام کا جواب نہیں دے سکتا۔ تم لوگ زندہ ہو‘ چھوٹی بڑی نیکیاں کر کے ثواب حاصل کر سکتے ہو۔ تمہاری عمر تمہیں مبارک ہو‘ اس لیے کہ جب مہلتِ عمر ختم کر کے دارالعمل چھوڑ دو گے تو نیکی نہ کر سکو گے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن شدّاد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بنی عذرا قبیلہ کے تین لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے‘ اسلام قبول کیا اور حضور ﷺ کے پاس ٹھہر گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’کون ہے جو ان کی خبر گیری کے سلسلہ میں مجھے بے فکر کر دے؟‘‘ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ’’مَیں اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں‘‘۔ چنانچہ تینوں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس رہنے لگے۔ (کچھ دنوں کے بعد) جب نبی اکرم ﷺ نے کسی طرف ایک لشکر بھیجا تو اس میں ان تینوں میں سے ایک شخص گیا اور میدانِ جنگ میں شہید ہو گیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے ایک اور لشکر بھیجا تو اس کے ساتھ دوسرا شخص گیا اور وہ بھی شہید ہو گیا۔ پھر تیسرے شخص نے

بستر پر ہی وفات پائی۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ تینوں جنّت میں ہیں۔ جو شخص اپنے بستر پر فوت ہوا تھا وہ تو سب سے آگے ہے‘ جو شخص دوسرے لشکر کے ساتھ جا کر شہید ہوا تھا وہ اس کے پیچھے بالکل اس کے قریب ہے اور جو پہلے لشکر کے ساتھ جا کر شہید ہوا تھا وہ سب سے آخر میں ہے۔ چنانچہ ان کے دل میں خلجان پیدا ہو گیا۔ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اپنے خواب کا ذکر کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ’’اس میں شک وشبہ اور خلجان کا باعث کون سی چیز ہے؟ (تم نے اپنے خواب میں تینوں کو جس ترتیب کے ساتھ دیکھا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے) اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس مسلمان سے زیادہ افضل کوئی نہیں جس نے اسلام کی حالت میں زیادہ عمر پائی اور اُس کی وجہ سے اُس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تسبیح وتکبیر اور تہلیل کا زیادہ موقع ملا۔‘‘ (مسند احمد)

واضح رہے کہ وہ تینوں شہادت کی نیت کے سبب تو ایک ہی مرتبے کے حامل تھے‘ مگر جو اُن کے بعد جیتا رہا اور عبادت کرتا رہا وہ ان دونوں سے افضل ٹھہرا‘ خواہ چند دن ہی زندہ رہا۔

ذرا اُس بوڑھے مسلمان کو دیکھیں جس کے بال سفید ہو چکے‘ جسم کمزور ہو گیا‘ مگر وہ اب بھی موت کی گھڑی سے غافل ہے۔ نماز کی اہمیت سے بے خبر ہے‘ اور زندگی کے دن بے فکری میں گزار رہا ہے۔ اس طویل عمری پر تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس نے موقع دیا کہ غفلت میں گزرنے والے ماہ وسال کو یاد کر کے اللہ کے حضور استغفار کیا جائے۔ بوڑھے کو اللہ تعالیٰ کئی سال پہلے بھی وفات دے سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اُسے نہ مزید نمازوں‘ روزوں اور دوسری نیکیوں کا موقع ملتا اور نہ ہی اُسے مغفرت طلب کرنے کی مہلت ملتی۔ یوں بڑی عمر وہ نعمت ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ہاں ارذل العمر سے پناہ مانگنی چاہیے جس میں انسان حواس کھو بیٹھے اور استغفار بھی نہ کر سکے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں مہلتِ عمر سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

تفسیر کا ارتقاء

بسلسلہ علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۱۲)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

اس ضمن میں درج ذیل نکات پیش نظر رکھنا ضروری ہیں:

(ا) تفسیر عہدِ رسالت میں

قرآن پاک کا نزول عربی زبان میں ہوا۔ اُس وقت جو لوگ موجود تھے' عربی ان کی مادری زبان تھی' اس لیے کلام اللہ کے معنی اور مطلوب سمجھنے اور معلوم کرنے زیادہ دِقّت پیش نہیں آتی تھی۔ سورۃ الزخرف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۳﴾

''ہم نے عربی زبان کا قرآن نازل فرمایا ہے تاکہ تم سمجھ لو۔''

تاہم بعض مقامات جہاں زیادہ اجمال ہوتا تھا' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود تشریح وتفسیر کرنے کی جسارت نہیں کرتے تھے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کرلیا کرتے تھے۔ حضورِ اَقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جہاں دیگر مناصبِ جلیلہ پر فائز کیا' وہیں ایک منصب قرآن کریم کی توضیح وتشریح کرنے کا بھی ہے' سورۃ النحل میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾ (آیت ۴۴)

''اور ہم نے آپ پر الذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ آپ اسے لوگوں کے لیے واضح کردیں۔''

چنانچہ علمِ تفسیر کا سب سے پہلا بیش قیمت سرمایہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول تفسیری روایات ہیں جو مختلف کتبِ احادیث میں بکھری ہوئی ہیں۔ امام بخاریؒ نے ایسی ہی تفسیری احادیث کو یکجا کر کے 'کتاب تفسیر القرآن' کے نام سے صحیح بخاری میں ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔

(ب) تفسیر عصرِ صحابہؓ میں

عہدِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد جب اسلامی فتوحات کا دائرہ آگے بڑھنے لگا اور تمدن میں وسعت پیدا

ہوتی گئی تو پھر دینی احکامات میں نئی نئی صورتیں اور مسائل پیدا ہونے لگے۔ اسی کے زیر اثر قرآن کریم کے مضامین اور آیاتِ اَحکام پر غور وفکر کے دروازے کھلنے لگے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قرآن کریم کی وہی تفسیر بیان کرتے جو انہوں نے بلا واسطہ یا بالواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہوتی یا جس آیت کا سبب نزول انہوں نے خود ملاحظہ کیا ہوتا یا پھر جو بات ان پر بطریق اجتہاد منکشف ہوتی۔ بعض اصحابِ رسولؐ کو اس ضمن میں امتیاز حاصل تھا' جیسے خلفائے راشدین میں سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں' مگر بحیثیت مجموعی سب سے زیادہ تفسیری اقوال اور روایات صحابۂ کرامؓ میں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب ہیں۔ حضرات صحابہؓ فہم قرآن اور اس کے معانی ومطالب کے اظہار و بیان میں مساوئ الدرجہ نہ تھے' اسی طرح وہ ذہانت وفطانت' خداداد استعداد اور زبان دانی میں بھی یکساں نہ تھے۔ بعض صحابہ اس حد تک ماہر اللسان تھے کہ غریب الفاظ بھی ان کی آنکھ سے اوجھل نہ تھے۔ بعض مرتبے میں اس سے کم تھے۔ کئی صحابہ کو صحبتِ نبویؐ سے مستفید ہونے کا زیادہ موقعہ ملا' کچھ اس حد تک موقع حاصل نہ کر پائے۔ مشہور تابعی حضرت مسروقؒ بیان کرتے ہیں: ''مجھے اصحابِ رسولؐ کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہے۔ صحابہ ایک تالاب کی مانند تھے' تالاب سے ایک آدمی بھی سیر ہوسکتا ہے' دو بھی' دس بھی اور سو بھی۔ بعض تالاب ایسے ہوتے ہیں کہ اگر روئے زمین کے تمام لوگ پانی پینے آئیں تو سیر ہوکر جائیں۔'' (تاریخ التشریع الاسلامی)

یوں تو ماہر تفسیر صحابہ کثیر تعداد میں تھے مگر ان میں سے درج ذیل دس صحابہ کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ حضرات ابوبکر صدیق' عمر فاروق' عثمان غنی' علی مرتضیٰ' عبداللہ بن مسعود' عبداللہ بن عباس' اُبی بن کعب' زید بن ثابت' ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم (علوم القرآن از ڈاکٹر صبح صالح)۔ اس دور میں تفسیری اقوال کو بطریق روایت نقل کیا جاتا تھا' حضرات صحابہؓ حضورِ اَقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی یہ اقوال نقل کرتے تھے اور باہم ایک دوسرے سے بھی۔

(ج) تفسیر عہدِ تابعین میں

عصر صحابہ کے بعد تفسیر کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس مرحلہ کی ابتدا عصرِ تابعین سے ہوئی جنہوں نے اصحابِ رسولؐ کے چشمہ فیض سے دل بھر کر اپنی پیاس بجھائی۔ تابعین کے عہد کے مفسّرین میں مجاہد' عطاء بن ابی رباح' عکرمہ' سعید بن جبیر' حسن بصری' ابوالعالیہ' مسروق اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہ ممتاز ہیں۔ غالباً سب سے پہلے فن تفسیر کی ابتدا جنہوں نے کی' وہ سعید بن جبیرؒ ہیں۔ عبدالملک بن مروان نے ان سے تفسیر لکھنے کی درخواست کی' چنانچہ انہوں نے تفسیر قرآن لکھ کر دربار خلافت بھیج دی۔ عطاء بن

دینار کے نام سے جو تفسیر معروف ہے' وہ درحقیقت یہی تفسیر ہے (میزان الاعتدال' ذہبی)۔ مکہ' مدینہ منورہ' بصرہ اور کوفہ اس دور میں علم تفسیر کے اہم مراکز تھے۔ مکہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اصحاب و تلامذہ مثلاً سعید بن جبیر' عطاء بن ابی رباح' مجاہد' عکرمہ اور طاؤس رحمہم اللہ کا فیض جاری تھا' ان میں مجاہدؒ کا پایہ سب سے بلند ہے۔ ابن تیمیہؒ کا قول ہے کہ مجاہدؒ کی تفسیر پر اکثر ائمہ مثلاً سفیان ثوری' شافعی' احمد بن حنبل اور امام بخاری رحمہم اللہ اعتماد کرتے ہیں۔ مدینہ میں علم تفسیر کی تاسیس کا سہرا حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سر ہے' اکثر نامور تابعین نے آپؓ سے کسبِ فیض کیا۔ تابعین مدینہ میں زید بن اسلم' ابوالعالیہ اور محمد بن کعب قرظی رحمہم اللہ کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔ کوفہ میں علمِ تفسیر کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پڑی۔ آپ سے فیض یاب ہونے والوں میں سے علقمہ' مسروق' اسود اور عامر شعبی رحمہم اللہ نے شہرت حاصل کی۔ بصرہ میں حضرت علی اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے فیض حاصل کرنے والے مشہور تابعی حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات تفسیر قرآن میں مرجع خلائق تھی۔ اس دور میں بھی تفسیری اقوال کو بطریق روایت ہی نقل کیا جاتا تھا۔

(د) تفسیر عہدِ تبع تابعین میں

علمِ تفسیر کے اس عہد کا آغاز اس وقت ہوا جب تدوین حدیث کی داغ بیل پڑی۔ حدیث نبوی مختلف ابواب میں منقسم ہوتی تھی اور ان میں ایک باب تفسیر پر بھی مشتمل ہوتا تھا۔ اس دور میں ایسی کوئی کتاب تالیف نہیں ہوئی جس میں ایک ایک قرآنی سورت اور ایک ایک آیت کی تفسیر علیحدہ علیحدہ تحریر کی گئی ہو۔

اس دور میں ایسے علمائے کرام موجود تھے جو مختلف اسفار کے ذریعے احادیث جمع کرتے اور تبعاً وضمناً وہ تفسیری اقوال بھی اکٹھے کرتے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' صحابہؓ یا تابعینؒ سے منسوب تھے۔ ان قابل ذکر اکابرین میں یزید بن ہارون السلمی' شعبہ بن حجاج' وکیع بن الجراح' سفیان بن عیینہ' عبدالرزاق بن ہمام اور عبد بن حُمید رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔

مذکورہ صدر علماء محدّثین میں سے تھے اور تفسیری اقوال کو احادیثِ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حیثیت سے جمع کرتے تھے' مستقل اور جداگانہ تفسیر کے اعتبار سے نہیں۔ ان ہستیوں نے اپنے پیش روائمہ سے علم تفسیر کے ضمن میں جو کچھ بھی نقل کیا تھا' اس کو ان کی جانب منسوب کر دیا تھا۔ لیکن افسوس کہ گردش روزگار نے ہم سے یہ سب مجموعے اوجھل کر دیے' بعینہٖ کوئی ہم تک نہیں پہنچ پایا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد کی تفاسیر میں یہ کافی حد تک محفوظ ہو گئے۔

(ہ) تفسیر عصرِ تدوین میں

عصرِ تدوین عہدِ خلافت اُموی کے اواخر سے لے کر خلافتِ عباسیہ کے اوائل تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی دور میں صحیح معنوں میں تفسیر نگاری کی بنیاد پڑی۔ ابنِ جریج دینی علوم کے پہلے باقاعدہ مصنف ہیں جنہوں نے علوم کی اوّلین تدوین کی۔ عصرِ تدوین سے پہلے تفسیری روایات احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ محفوظ تھیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث مختلف ابواب میں منقسم تھیں اور ان میں سے ایک باب تفسیری روایات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ لیکن تدوین کے مرحلے پر پہنچ کر علمِ تفسیر باقاعدہ علمِ حدیث سے علیحدہ ہو گیا اور اس نے ایک جداگانہ فن کی حیثیت اختیار کر لی۔ اب قرآنی ترتیب کے مطابق ہر ہر آیت اور سورت کی جداگانہ تفسیر مرتب کی جانے لگی۔ اس کارِ خیر میں ابن ماجہ' ابن جریر طبری' ابن ابی حاتم' ابوبکر بن منذر' ابوالشیخ بن حبان حاکم اور دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ نے حصّہ ڈالا۔ یہ تفاسیر سنداً حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' صحابہؓ و تابعینؒ اور تبع تابعینؒ سے منقول ہیں' ان میں تفسیر بالماثور کے علاوہ کوئی دوسری بات مذکور نہیں۔ البتہ ابن جریر طبریؒ نے تفسیری اقوال ذکر کر کے ان کی توجیہہ کی' ان میں سے بعض کو راجح اور بعض کو مرجوح قرار دیا۔ جلال الدین سیوطیؒ نے تفسیر ابن جریر طبری کے بارے میں لکھا ہے:

''اگر تم مجھ سے دریافت کرو کہ کس تفسیر پر اعتماد کیا جائے تو میں کہوں گا کہ ابن جریر پر' جس کے بارے میں علماء کا قول ہے کہ اس جیسی کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔'' تاہم اس فرق و اختلاف کے باوجود اس دور کا علم تفسیر بھی تفسیر بالماثور کے دائرے میں ہی رہا' البتہ اسناد کی شرط باقی نہ رہ سکی۔ مفسرین سلف کے تفسیری اقوال کو بلاسند ذکر کرنے کا سب سے مہلک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اسرائیلیات اور بہت سے من گھڑت' وضعی اقوال نے کتب تفاسیر میں راہ پالی اور مستند صحیح اقوال اور من گھڑت غیر مستند اقوال کے مابین امتیاز کرنا دشوار ہو گیا۔ یہی چیز بعد میں مختلف گمراہیوں کا سبب بنی۔

(و) تفسیر عصرِ تدوین کے بعد

یہاں سے تفسیر کا پانچواں عہد شروع ہوتا ہے۔ یہ تفسیر کا طویل ترین تاریخی دور ہے جو عباسی خلافت سے شروع ہو کر عصرِ حاضر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سے قبل تفسیر کا انحصار منقول روایات پر تھا لیکن اس دور میں عقل و نقل میں امتزاج و اختلاط کا آغاز ہوا' صرف و نحو اور عربیت سے متعلق علوم مدوّن ہوئے' فقہی مسالک منظر عام پر آئے اور کلامی مسائل نے سر نکالا۔ خلافت عباسیہ میں گروہی تعصب انتہا تک پہنچ گیا' مختلف اسلامی فرقے اپنے مخصوص افکار و عقائد کی دعوت دینے لگے' منطق و فلسفہ سے متعلق کتب کا یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ مختلف علوم علم تفسیر کے ساتھ

ملتے چلے گئے۔ جو شخص جس علم وفن میں کمال رکھتا تھا' اس کی کتاب تفسیر تقریباً اسی علم وفن تک محدود ہو کر رہ گئی' جامعیت کا تصوّر ختم ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ نحوی علماء نے جو تفاسیر لکھیں ان کو نحوی مسائل سے بھر دیا' جیسے زجاج نے اپنی تفسیر میں' واحدی نے اپنی 'البسیط' میں اور ابوحیان نے 'البحر المحیط' میں نحوی مہارت کا ہی ثبوت دیا ہے۔ جو لوگ علومِ عقلیہ میں بصیرت رکھتے تھے۔ انہوں نے اس فن کو حکماء اور فلاسفہ کے اقوال نیز علم کلام کا پلندہ بنا دیا۔ امام فخر الدین رازیؒ کی تفسیر 'مفاتیح الغیب المعروف تفسیر کبیر' اسی کا شاہکار ہے۔ صاحبِ تفسیر کبیر کا انداز یہ ہے کہ عقلی ونقلی قسم کے جس قدر تفسیری اقوال مختلف تفاسیر میں بکھرے ہوئے تھے' اس تفسیر میں ان سب کو جمع کر دیا گیا ہے۔

مبتدعین نے جو تفاسیر لکھیں ان میں کلامِ الٰہی کی تاویلاتِ رکیکہ کر کے ان کتب کو اپنی پسندیدہ بدعات کی تائید وحمایت پر مشتمل اقوال سے بھر دیا۔ مثلاً معتزلہ میں سے زمخشری' رمانی' جبائی اور شیعہ اثنا عشریہ میں سے طبری اور ملا محسن کاشی وغیرہ۔ فقہاء کی تفاسیر فقہی فروعات کے دلائل ذکر کرنے تک محدود ہیں' جیسے جصاص اور قرطبی وغیرہ۔ مؤرخین نے جو تفاسیر لکھیں ان کو صحیح وسقم واقعات اور اخبار سے بھر دیا' مثلاً ثعلبی اور خازن کی تفاسیر وغیرہ۔ صوفیاء نے قرآنی آیات سے اس طرح کے اشارات کا استخراج کیا جو ان کے مسلک ومشرب اور وجدان وریاضت سے میل کھاتے تھے' جیسے ابن عربی اور ابوعبدالرحمٰن السلمی وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ جو شخص بھی کسی فن یا مسلک سے دلچسپی رکھتا تھا' اس نے قرآن کریم کو اپنے مسلک ومذہب اور فن کے قالب میں ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ یہ علمی' عقلی اور ذہنی رجحان و میلان جاری رہا اور بعض ادوار میں اس کو قبولیت بھی حاصل ہوئی۔ عصر حاضر میں بھی ایسے مفسر موجود ہیں جن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن عزیز کو ظاہری وباطنی علومِ عصریہ کا گنجینہ ثابت کریں' چاہے ان کو تاویلات کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے۔ ان کے نزدیک قرآن مجید کے وجوہِ اعجاز میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ زمانۂ حال کے ساتھ چل سکے۔ حق یہ ہے کہ ایسی بات خود قرآن کریم کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ یہ تو کتابِ ہدایت ہے اور ایسی کوششوں سے قرآن کریم اپنے اس ہدف اور نصب العین سے باہر نکل جاتا ہے جس کے لیے اسے اُتارا گیا تھا۔

تفسیر کے علاوہ قرآن کریم کے خاص خاص مباحث پر جداگانہ اور مستقل تصانیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ کسی نے صرف فقہی مسائل پر بحث کی' کسی نے اسبابِ نزول پر کتاب لکھی' کسی نے امثال قرآنی کو یکجا کیا' کسی نے آیاتِ مکررہ کے نکات بیان کیے' کسی نے مفردات القرآن پر کام کیا' کسی نے ناسخ ومنسوخ کو اپنی تحریر کا عنوان بنایا' وغیرہ۔ اس قسم کے مختلف مضامین کی تعداد اسّی کے قریب پہنچی اور تقریباً ہر ایک پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ (مقدمہ الاتقان فی علوم القرآن) ان سب تصانیف کو درج

ذیل چھ اقسام پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) **فقہی:** جن میں ان آیات کو یکجا کیا گیا ہے جن سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے' جیسے احکام القرآن از اسماعیل بن اسحاق' احکام القرآن از ابوبکر جصاص رازی' احکام القرآن از قاضی یحییٰ بن اکثم وغیرہ۔

(۲) **ادبی:** ان تصنیفات میں قرآن کریم کا فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے بے نظیر ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ وہ کتب بھی اس سلسلے میں شامل ہیں جو کلام اللہ میں ضرب الامثال' حقیقت ومجاز' تشبیہات و استعارات اور صنائع وبدائع کے حوالے سے تحریر ہوئیں۔ اس ضمن میں جاحظ' جرجانی' ابن ابی الاصبع' عزالدین بن عبدالسلام اور ابوالحسن ماوردی وغیرہ کا نام آتا ہے۔

(۳) **تاریخی:** اسی طرح کی کتب میں قرآن عزیز میں مذکور انبیائے سابقین اور بزرگ ہستیوں کے قصوں کی تفصیل اور مزید حالات پر روشنی ڈالی گئی' مثلاً خازن اور ثعلبی کی تفسیر وغیرہ۔

(۴) **نحوی:** جن میں قرآن مجید میں پیش آمدہ نحوی مسائل سے بحث کی گئی ہے' جیسے اعراب القرآن از رازی' زجاج کی تفسیر وغیرہ۔

(۵) **لغوی:** ایسی تصانیف جو قرآن کریم کے مفرد الفاظ کے معانی اور ان کی تحقیق کے حوالے سے لکھی گئیں' مثلاً مفردات القرآن از امام راغب اصفہانی اور لغات القرآن از ابوعبیدہ وغیرہ۔

(۶) **کلامی:** ایسی تفسیری کتب جن میں خصوصاً ایسی آیات پر مفصل بحث کی گئی ہو جن سے عقائد کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں' جیسے تفسیر کبیر' تفسیر بیضاوی وغیرہ۔

غرض یہ کہ آغازِ نزول سے لے کر عصرِ حاضر تک اُمّتِ مُسلمہ نے قرآن پاک کے مطالب ومعانی اور اَسرار ونکات معلوم کرنے کے لیے جو مساعیٔ جمیلہ انجام دی ہیں' کوئی دوسری قوم اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی' لیکن بایں ہمہ جُہد وسعی قرآن مجید کی وسعت وجامعیت کا یہ عالَم ہے کہ اس کے بحرِ معانی میں غواصی کرنے والے ہر فرد کو عجز وتقصیر کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔ قرونِ اولیٰ سے لے کر عہدِ حاضر تک لاتعداد تفاسیر لکھی گئیں اور تحریر کی جا رہی ہیں' مگر ارشادِ نبویؐ کے مطابق قرآن کریم کے نکات و اسرار اور حکمتیں نہ ختم ہو سکتی ہیں اور نہ ہی آئندہ کبھی ان کی تکمیل ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:

> ''قرآن میں پچھلی قوموں کے حالات مذکور ہیں' اس میں تمہارے فیصلہ جات بھی مرقوم ہیں۔ یہ فیصلہ کن کتاب ہے' ہنسی مذاق پر مشتمل نہیں۔ جو از راہ بغاوت اس کو نظر انداز کرے گا' خدا اس کو توڑ پھوڑ دے گا۔ جو اس کو چھوڑ کر کسی اور کتاب سے ہدایت طلب کرے گا' اللہ تعالیٰ اُس کو گمراہ کر دے گا' یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے' یہ ذکر حکیم اور صراطِ مستقیم ہے۔ اس کی وجہ سے خیالات میں بے راہ روی نہیں آتی اور نہ ہی زبان میں اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ علماء اس کو پڑھتے

پڑھتے سیر نہیں ہوتے' بار بار پڑھنے کے باوجود اس سے اُکتاہٹ اور ملال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہی کتاب ہے کہ جب جنوں نے اسے سنا تو پکار اٹھے: ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱﴾ (الجن) ''بے شک ہم نے عجیب قرآن سنا ہے''۔ جو شخص قرآن کے مطابق بات کرے گا وہ سچ بولے گا اور جو اس پر عمل کرے گا اسے اجر دیا جائے گا۔ جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا وہ عدل وانصاف سے کام لے گا اور جو اس کی طرف دعوت دے گا وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہوگا۔'' (جامع ترمذی)

تفسیر میں اختلافِ سلف

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن کریم کی تفسیر عربی زبان اور ان اسباب وعوامل کے پیش نظر کرتے تھے جن میں ان کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا۔ جب انہیں کسی آیت کی تفسیر میں کوئی دقت پیش آتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کر لیتے۔ آنے والے وقت میں تابعی مفسرین صحابہؓ کے پاس پہنچ کر ان سے تفسیری اقوال اخذ کرتے اور سوالات کے جوابات پاتے۔ مخصوص حالات میں وہ اس حوالے سے رائے واجتہاد سے بھی کام لیتے۔ عربی ان کی مادری زبان تھی اور معاشرے میں ابھی اتنا فساد وبگاڑ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح عصر صحابہؓ وتابعینؒ تک فقہی وکلامی مذاہب اور مسالک وجود میں نہیں آئے تھے' اور نہ ہی ادبی وعقلی فنون کا کوئی نشان پایا جاتا تھا' اگرچہ اس بیج کی تخم ریزی تو ہو چکی تھی جس سے آگے چل کر علم وادب کا تناور درخت پروان چڑھا اور اس سے مزید علوم وفنون کی شاخیں پھوٹیں۔ یوں صحابہؓ اور تابعینؒ کے ادوار میں تفسیری اختلافات کا دائرہ نہایت محدود رہا اور اس میں وہ وسعت پیدا نہ ہو پائی جس کا اظہار آگے چل کر ہوا۔

عہدِ صحابہ میں تو اختلاف نہایت کم تھے' البتہ عہدِ تابعین کے اندر ان میں کچھ اضافہ ہو گیا' مگر تابعین کا اختلاف احکام میں زیادہ اور تفسیر میں کم تھا۔ متقدمین کی کتب تفسیر میں جو تفسیری اقوال بکھرے پڑے ہیں' ان میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات ایک ہی مسئلہ میں کئی کئی مختلف اور متضاد اقوال منقول ہیں۔ مثلاً ایک صحابی کا قول دوسرے صحابی کے قول کے خلاف ہوتا ہے اور ایک تابعی کا قول دوسرے تابعی کے قول سے ٹکراتا ہے۔ بلکہ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ایک ہی مسئلہ دو مختلف اور متضاد قول ایک ہی قائل کی جانب منسوب ہوتے ہیں۔ تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ عہدِ صحابہ اور تابعین میں تفسیری اختلاف کی خلیج بہت وسیع ہو گئی تھی؟ اور کیا ایک ہی صحابی وتابعی سے ایک ہی مسئلہ میں دو متضاد ومتناقض آراء اور فتاویٰ کا ظہور ہوتا ہے؟ لیکن معاملہ دراصل یوں نہیں۔ نہ تو باہمی اختلاف کے دائرے میں وسعت پیدا ہوئی اور نہ ہی صحابی وتابعی سے دو مخالف اور متناقض قول صادر ہوئے۔ اس لیے کہ تفسیر میں جو اختلاف منقول ہے وہ اکثر وبیشتر نزاعِ لفظی اور اختلافِ تنوع کی قبیل سے ہے'

مگر اسے پیش کرنے والوں نے ان کو متباین ومتضاد اقوال خیال کیا' جن میں کسی طرح بھی کوئی موافقت ویگانگت نہیں پائی جاتی۔ ان بظاہر متخالف اقوال کا اگر باریک بینی اور دِقّت نظر سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں حقیقتاً کوئی فرق واختلاف موجود ہی نہیں۔ تاہم نظر آنے والے ظاہری اختلاف کی کچھ وجوہ اور اسباب بھی ہیں' جن کی نشان دہی سے یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ ان میں باہم کچھ تنافی وتباین نہیں پایا جاتا۔ ظاہری اختلاف کی وجوہ درج ذیل ہیں:

(۱) باہمی اختلاف کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں مفسر اپنا اپنا مفہوم جداگانہ الفاظ وعبارت سے ادا کرتے ہیں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام متعدد ومختلف ہیں مگر وہ سب ایک ہی مسمّٰی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اب کوئی شخص اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ایک نام لے کر دعا کرتا ہے تو دوسرا فرد اس کو جداگانہ نام سے پکارتا ہے۔ اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ ایک شخص کی دُعا دوسرے کی دُعا کے خلاف ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۱۱۰) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾

''آپ کہہ دیجئے کہ (اللہ کو) اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔ جس نام سے بھی پکارو تو تمام اچھے نام اُسی کے ہیں)۔''

اسی طرح حضورِ اَقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے بھی بہت سے صفاتی نام ہیں جو سب ایک ہی مسمّٰی کو ظاہر کرتے ہیں اور ان میں کوئی تخالف یا تضاد نہیں پایا جاتا۔ صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ ایک صفاتی نام مسمّٰی کی ایک خاص صفت کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرا نام کسی اور صفت کو۔ مسمّٰی واحد ہی رہتا ہے اور اس میں بذاتِ خود کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ مثلاً علیم کا وصفی نام ایک ذات اور اس کے علم کو ظاہر کرتا ہے اور لفظ قدیر اُس ذات اور اس کی قدرت کی نشان دہی کرتا ہے۔ یونہی حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف اسماء آپؐ کی مختلف صفات کا مظہر ہیں' جیسے ماحی' حاشر' عاقب وغیرہ۔ اور قرآن مجید کے مختلف نام الکتاب' الفرقان' الھدیٰ' المجید' التنزیل' الذکر وغیرہ' اس کی مختلف صفات کے متعلق آگہی دیتے ہیں۔

اب غور کریں کہ قرآن پاک میں ''الصِّرَاطَ الْمُستَقِيمَ'' کے الفاظ آئے ہیں اور اس کی تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں: (ا) اس سے قرآن کریم کی پیروی مراد ہے۔ (ب) اس سے سُنّتِ نبوی اور جماعتِ مُسلمین کا اتباع مقصود ہے۔ (ج) اس سے طریق عبودیت مراد ہے۔ (د) اللہ تعالیٰ اور حضورِ اَقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا نام صراطِ مستقیم ہے' وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان اقوال میں کوئی منافات نہیں بلکہ یہ سب متحد الحقیقت ہیں' اس لیے کہ دین اسلام' اتباعِ قرآن' اللہ ورسول کی اطاعت اور طریق عبودیت سے عبارت ہے۔ گویا سب بظاہر مختلف اقوال کا منشا ومقصود ایک ہی ہے' مگر ہر شخص

نے اس کی ایک جداگانہ صفت بیان کی۔

(۲) ظاہری اختلاف کی ایک قسم یہ ہے کہ بطور تمثیل ایک عام اسم کی بعض انواع کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ سامع کو اس نوع کا پتہ چل جائے' اس عام اسم کو عموم و خصوص کے اعتبار سے تعریف کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ مثلاً قرآن کریم کی سورۃ فاطر (آیت ۳۲) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ﴾

''پھر ہم نے یہ کتاب ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچائی جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے پسند فرمایا۔ پھر بعض تو ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں' اور بعض متوسط درجے کے ہیں' اور بعض ان میں اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کیے چلے جاتے ہیں۔''

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ 'سَابِق' اوّل وقت نماز پڑھنے والے کو کہتے ہیں اور 'مُقْتَصِد' وہ ہے جو متوسط درمیانے وقت میں نماز ادا کرے اور 'ظَالِم' وہ ہے جو نماز قضا کر کے پڑھے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ 'سَابِق' وہ ہے جو فرض زکوٰۃ نفلی صدقات سمیت ادا کرے اور 'مُقْتَصِد' وہ ہے جو صرف فرض زکوٰۃ ادا کرے اور 'ظالم' اس کو کہتے ہیں جو زکوٰۃ ادا نہ کرتا ہو۔ بعض کے نزدیک 'سابق' وہ ہے جس کی نیکیاں بدیوں پر غالب ہوں' اور 'مُقْتَصِد' وہ ہے جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں اور 'ظالم' وہ ہے جو کہ محرمات کا ارتکاب کرتا ہو وغیرہ۔ مذکورہ بالا مفسرین میں سے ہر ایک نے عام افراد میں سے ایک ایک فرد کو مثال کے طور پر ذکر کیا ہے' بطریق حصر نہیں کیا۔ جیسے سابق ایک عام لفظ ہے اور اس کا اطلاق اوّل وقت نماز پڑھنے والے پر بھی ہوتا ہے اور اسی طرح فرض زکوٰۃ مع نفلی صدقات ادا کرنے والے پر بھی۔ چنانچہ ایک مفسر نے ایک نوع کا ذکر کر دیا اور دوسرے نے دوسری قسم کا۔ دونوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ جو مفہوم مَیں بیان کر رہا ہوں وہی صحیح ہے اور دوسرا غلط۔ اسی طرح ظالم اُس شخص کو بھی کہتے ہیں جو فرائض و واجبات کو ضائع کرنے والا ہو اور اُس کو بھی جو محرمات کی حرمت کو توڑتا ہو۔ اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ مندرجہ صدر اقوال میں کسی قسم کا بھی تباین و تناقض نہیں پایا جاتا۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ ایک مفسر کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں واقعہ پر نازل ہوئی اور دوسرا کہتا ہے کہ فلاں واقعہ میں' گویا دونوں مفسر الگ الگ واقعہ کو ایک آیت کا سبب نزول ٹھہراتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی منافات کا کوئی احتمال نہیں' اس لیے کہ آیت کے الفاظ میں دونوں واقعات کی گنجائش ہوتی ہے اور دونوں کو ہی آیت کا سبب نزول قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۳) ظاہری اختلاف یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض الفاظ میں دو یا دو سے زیادہ معانی کا احتمال ہوتا ہے' جیسے کہ وہ لفظ مشترک ہو اور متعدد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہو۔ مثلاً 'قَسْوَرَة' کا لفظ کلام اللہ میں استعمال ہوا ہے' اس کے معنی تیر انداز کے بھی ہیں اور شیر کے بھی۔ اسی طرح لفظ 'عَسْعَسَ' استعمال ہوا ہے' جس کے معنی رات کا آنا بھی ہے اور جانا بھی۔ اسی طرح ایک لفظ اصالۃً دو معانی کا متحمل ہوتا ہے مگر اس سے ایک نوع یا ایک شخصیت مراد لی جاتی ہے' مثلاً سورۃ النجم کی درج ذیل آیات کی ضمیریں:

﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ فَكَانَ قَابَ قَوۡسَيۡنِ اَوۡ اَدۡنٰى ۝۹﴾

''پھر وہ قریب ہوا اور جھکا۔ پس دو کمانوں کے بقدر فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم۔''

اب بعض مفسّرین نے ان ضمائر کا مرجع اللہ تعالیٰ کو ٹھہرایا ہے اور بعض کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کا مصداق ہیں۔ اس قسم کی آیات میں علمائے سلف کے بیان کردہ تمام معانی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ یا تو آیت قرآنی دو مرتبہ نازل ہوئی ہو' ایک معنی کا تعلق ایک واقعہ سے ہوگا اور دوسرے کا دوسرا واقعہ کے ساتھ۔ یا اس طرح کہ وہ لفظ مشترک ہونے کے اعتبار سے دو یا دو سے زیادہ معانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے دو معانی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں اور اس سے زیادہ بھی۔ اکثر فقہائے مالکیہ' شافعہ' حنابلہ اور بہت سے متکلّمین کا نقطہ نظر یہی ہے۔

(۴) ظاہری اختلاف کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مختلف مفسّرین کسی آیت یا لفظ کا مفہوم ایسے الفاظ میں بیان کریں جو باہم قریب المعنیٰ ہوں' لیکن بالکل مترادف (ہم معنیٰ) نہ ہوں' اس لیے کہ مترادفات لغت میں بہت کم اور قرآن کریم میں نادر یا معدوم ہیں۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کسی لفظ کا مفہوم ظاہر کرنے کے لیے ایسا لفظ استعمال کیا جائے جو اس کے جملہ معانی کا احاطہ کرتا ہو' بلکہ ہوتا یوں ہے کہ کسی لفظ کے مفہوم کی ترجمانی ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جو اس سے قریب المعنیٰ ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ الطور کی آیت ہے: ﴿يَوۡمَ تَمُوۡرُ السَّمَآءُ مَوۡرًا ۝۹﴾ ''جس روز آسمان حرکت کرنے لگے گا۔'' اب کوئی اس کا ترجمہ کرتے ہوئے یوں کہے کہ 'مور' کے معنی حرکت کے ہیں' تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے 'مور' کے لفظ کی ترجمانی اس کے قریب المعنیٰ لفظ کے ذریعے کر دی ہے' اس لیے کہ 'مور' کے معنی صرف حرکت کے نہیں بلکہ حرکت خفیفہ سریعہ کے ہیں۔ اسی طرح سورۃ الانعام میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَنۡ تُبۡسَلَ نَفۡسٌۢ بِمَا كَسَبَتۡ ۚ﴾ (آیت ۷۰) ''کہ کسی جان کو اس کے کرتوتوں کی وجہ سے قید کیا جائے۔'' اب اس کی توضیح میں بعض مفسرین نے تُبْسَلَ کے معنی تُحْبَسَ (قید کیا جائے) بیان کیے ہیں اور بعض نے تُرْتَهَنَ (رہن رکھا جائے) بتائے ہیں۔ یہ تضاد نہیں بلکہ ایک لفظ کے مفہوم کو قریب المعنیٰ لفظ کے ذریعے ادا کیا گیا ہے۔

(۵) ظاہری اختلاف کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک ہی آیت میں ایک لفظ دو یا دو سے زیادہ قراءتوں کے مطابق پڑھا جاتا ہو۔ اب ایک مفسّر ایک قراءت کے مطابق تفسیر کرتا ہو اور دوسرا مفسر دوسری قراءت کو پیش نظر رکھتا ہو اور قاری اس کو اختلاف پر محمول کر لے حالانکہ دراصل یہ اختلاف ہے ہی نہیں۔ جیسے ابن جریر طبریؒ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ سورۃ الحجر کی آیت ۱۵ میں ''سُکِّرَتْ اَبْصَارُنَا'' میں 'سُکِّرَتْ' کے معنی ہیں ''بند کی گئیں'' اور حضرت ابن عباسؓ کا ہی دوسرا قول ہے کہ اس کا معنیٰ ''جادو کیا گیا'' ہے۔ قتادہؒ نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ جو ''سُکِّرَتْ'' مشدد پڑھتا ہے وہ اس کے معنی ''بند کی گئیں'' کرتا ہے اور جو اس لفظ کو بلاتشدید ''سُکِرَتْ'' پڑھتا ہے وہ اس کا مفہوم مسحور مراد لیتا ہے۔ اسی اختلاف کی ایک اور مثال حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں منقول ہے کہ سورۃ النساء کی آیت ﴿اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ (آیت ۴۳) کے معنیٰ کیا عورتوں سے مباشرت کے ہیں یا صرف انہیں چھونے کے؟ اب اگر ''لَامَسْتُم'' پڑھا جائے تو اس کا مفہوم مباشرت کا ہے اور اگر 'لَمَسْتُمْ' قراءت کی جائے تو پھر اس سے چھونے کا مفہوم مراد ہوگا۔ گویا اس مقام پر کوئی معنوی اختلاف نہیں۔

یہ ہیں وہ طرق اور وجوہ جن کے ذریعے ہم سلف سے منقول بظاہر متعارض اقوال میں اتحاد و یگانگت پیدا کر سکتے ہیں۔ اور اگر بظاہر مخالف تفسیری اقوال میں مندرجہ بالا طرق کے مطابق جمع و تطبیق کا کوئی امکان نہ ہو اور بقول ابن تیمیہؒ ایسا بہت کم ہوتا ہے' تو پھر ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہ باہمی اختلاف کس سے منقول ہے۔ اگر یہ دونوں متضاد اقوال ایک ہی مفسر کے ہوں اور وہ مختلف اسناد سے نقل کیے گئے ہوں جن میں سے ایک سند صحیح ہو اور دوسری ضعیف' تو ایسی صورت میں صحیح سند کو ترجیح حاصل ہوگی اور دوسری متروک قرار دے دی جائے گی۔ اور اگر صحت سند میں دونوں کا درجہ مساوی ہو تو ایسی صورت میں ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ایک قول دوسرے سے متاخر ہے تو پھر متاخر قول قابل ترجیح ہوگا اور دوسرا غیر مقبول۔ اور اگر متقدم و متاخر قول کا علم نہ ہو پائے تو پھر دیکھا جائے گا کہ راوی سے کسی قول کا سماع ثابت ہے تو وہی مقبول ہے۔ اب اگر سماع بھی ثابت نہ ہوتا ہو تو پھر ایک قول کو اگر بطریق استدلال قوی قرار دیا جا سکتا ہو تو وہ راجح ہوگا اور دوسرا مرجوح۔ اور اگر ان دونوں اقوال کے حق میں مساوی دلائل ہوں تو پھر مرادِ الٰہی پر ایمان لانا چاہیے اور دونوں میں سے کسی ایک قول کے تعین اور صحیح ہونے پر زور نہیں دینا چاہیے اور نہ ہی اس بارے زیادہ بحث و مباحثہ ہو۔ اس حوالے سے امام زرکشی کا کہنا ہے کہ اگر اختلاف اقوالِ صحابہؓ کے مابین ہو اور جمع و تطبیق کا کوئی امکان بھی نہ پایا جا رہا ہو' تو پھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے کو ترجیح حاصل ہوگی' اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے کہ اے اللہ! ان (حضرت ابن عباسؓ) کو تفسیر قرآن سکھلا دے۔ (الاتقان) (جاری ہے)

اور جن کو اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ وہ ملک جو اسلام کے نام پر بنا تھا اب اس میں ایک بڑا آئیڈیالوجیکل اور ڈیموگرافک چینج آ چکا ہے جس کے ذریعے وہ طبقہ یہاں غالب آ چکا ہے جو عالمی قوتوں کا منظورِ نظر اور دجّال کی عالمی حکومت کے قیام میں ان کا سہولت کار ہے۔

اب ہم کہتے ہیں کہ امریکہ نے پاکستان میں مداخلت کی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مغرب جس کا امریکہ اس وقت امام ہے اور جس کی شہ رگ پنجۂ یہود میں ہے اُس نے صدیوں محنت کر کے کلونیل اور دجّالی مقاصد کے تحت مسلم معاشروں میں جس طبقے کو پالا پوسا ہے اور نائن الیون کے بعد بیس سالہ جنگ میں جس طبقہ نے مغربی مفادات کا کھل کر تحفظ کیا ہے وہ اب امریکی مفادات سے الگ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اس کو پالا پوسا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس کے ذریعے دجّال کی عالمی حکومت کا راستہ ہموار کیا جائے! لیکن افسوس اُن دینی سیاسی جماعتوں پر ہوتا ہے جنہوں نے ان طبقات کا حلیف بن کر مغربی مفادات کو مزید مستحکم کیا اور دانستہ و غیر دانستہ پاکستان میں دجّالی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کر دیا۔ اب اس دجّالی گرفت سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے اور وہ قرآن میں واضح کر دیا گیا ہے کہ:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ (البقرہ)

''اللہ ولی ہے اہلِ ایمان کا' وہ انہیں نکالتا رہتا ہے تاریکیوں سے نور کی طرف۔ اور (ان کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا' اُن کے اولیاء (پشت پناہ' ساتھی اور مددگار) طاغوت ہیں' وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں آگ والے' یہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

اللہ کے راستے پر چلنے کا بنیادی تقاضا ہماری نظر میں یہی ہے کہ اول تمام مذہبی اور دینی جماعتیں مغربی مفادات پورے کرنے والے طبقات سے الگ ہو جائیں اور پھر عوام کو استعماری فکری اندھیروں اور دجل و فریب سے نکال کر وحی الٰہی کی روشنی میں لانے کی کوشش کریں اور پھر اپنے معاشروں میں اسلام کے نفاذ کی جِدّ و جُہد منہجِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام روشنی میں کریں' کیونکہ صرف مذہبی اور دینی طبقہ ہی عوام کو مغرب اور امریکہ کی غلامی سے نکال کر حقیقی آزادی پر مبنی مستقبل سے ہمکنار کر سکتا ہے' بشرطیکہ وہ خود پہلے فیصلہ کر لے کہ اُسے طاغوت کا ساتھ دینا ہے یا پھر اللہ کے راستے پر چلتے ہوئے عوام' اسلام اور پاکستان کا ساتھ دینا ہے۔

June 2022
Vol.71

Regd. CPL No.115
No.6

Monthly **Meesaq** Lahore

موسس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نگران: شجاع الدین شیخ

رجوع الی القرآن کورس

داخلے جاری ہیں

خواتین کیلئے شرکت کا باپردہ انتظام ہے

صبح 08:45 تا دوپہر 01:00 بجے

پیر تا جمعہ

دورانیہ: 10 ماہ

مضامین تدریس

سال اوّل

- بیان القرآن
- قرآن حکیم کا منتخب نصاب
- سیرت النبی ﷺ
- توسیعی محاضرات
- ترجمہ قرآن حکیم مع ترکیب
- سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم
- عربی گرامر
- ناظرہ قرآن حکیم و تجوید
- عقیدہ و فقہ
- فکر اسلامی
- حدیث و سنت

سال دوم

- علم العقیدہ
- اصول التفسیر
- اصول الحدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- علوم القرآن
- تفسیر القرآن
- علم الحدیث
- فقہ العبادات
- اللغۃ العربیۃ وادبھا
- الفکر الاسلامی

ہاسٹل کی سہولت قرآن اکیڈمی یسین آباد میں صرف حضرات کے لیے دستیاب ہے

www.QuranAcademy.com
info@QuranAcademy.com

قرآن اکیڈمی ڈیفنس	قرآن اکیڈمی یسین آباد	قرآن اکیڈمی کورنگی	قرآن انسٹیٹیوٹ گلستان جوہر	قرآن انسٹیٹیوٹ لطیف آباد حیدر آباد
021-35340022-4	021-36806561	021-35078600	021-34030119	0334-3350910
0334-3088689	0331-7292223	0343-1216738	0323-4030119	0345-2701363